بسم الله الرحمن الرحيم

اسلام
اور
سیکولرزم

نام کتاب: **اسلام اور سکیولرازم**

مؤلف: **سید جواد نقوی**

ترتیب: **مرکز تحقیقات اسلامی بعثت**

ناشر: **متاب پبلی کیشنز**

اشاعت: سوم، ربیع الاوّل ۱۴۴۳ھ، (اکتوبر ۲۰۲۱)

تعداد: **۲۰۰۰**

جملہ حقوق بحق **متاب پبلی کیشنز** محفوظ ہیں

عرضِ ناشر

کسی بھی معاشرے کی مادی، روحانی، معیشتی، سیاسی، ثقافتی اور اخلاقی بنیاد دراصل اس معاشرے کے افراد میں پائے جانے والے ان افکار ونظریات پر استوار ہوتی ہے جس کے تحت وہ اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ آج اگر دنیا کی اکثر اقوام خصوصاً مغربی تہذیب کا بغور مطالعہ ومشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی ثقافتی واخلاقی پستی کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، وہاں انا پرستی وخودغرضی کی سیاست کا دور دورہ ہے، مذہب کو زندگی میں انتہائی معمولی درجہ کی ثانوی حیثیت حاصل ہے، مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے کا مخالف گردانا جاتا ہے، آزادی کے نعرے کی آڑ میں ہر قسم کی شہوت پرستی عام اور سرعام ہے، منشیات کے بے دریغ استعمال میں کوئی قباحت نہیں ہے، قمار بازی دلچسپ مشغلہ ہے، روحانی قدر و قیمت کا کوئی پاس و لحاظ نہیں ہے، مادیت پرستی فکر کا محور ہے، مشینوں کا غلام بن کر دولت کا پجاری بننا اور اسبابِ تعیش کی تلاش میں جنایتکاریوں کا مرتکب ہونا ان کے نزدیک عام سی باتیں ہے۔

ان تمام مفاسد کے پیچھے جو نظریہ کارفرما ہے اس کے تانے بانے ''سکیولرازم'' کے نظریہ سے ملتے ہیں۔ مغربی معاشرے کی بنیاد میں ''سکیولرازم'' جیسا مہلک اور بے مہار نظام کارفرما ہے جو اپنے دامن میں نا قابلِ اصلاح بدبختیاں سموئے ہوئے ہے۔ دشمنانِ اسلام ہمیشہ سے اسلام کو نقصان پہنچانے کی خاطر مختلف حربے استعمال کرتے رہے ہیں مثلاً کبھی مسلمانوں کو فرقوں میں بانٹنا، کبھی فرقہ واریت کو ہوا دینا تو کبھی جنگ مسلط کرنا لیکن سب سے خطرناک حربہ فکری حملہ ہے۔ ''سکیولرازم'' ایک فکری ناسور ہے جسے وہ اسلام کی نابودی کیلئے بروئے کار لانا چاہتے ہیں البتہ وہ جانتے ہیں کہ سب مسلمانوں کو اسلام سے منحرف اور برگشتہ کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے لہٰذا مسلم معاشروں میں سکیولرازم کو نافذ کرنے کیلئے وہ بے پناہ دولت، توانائیاں، صلاحیتیں اور وقت صرف کررہے ہیں۔ وہ جدید مغربی نظامِ تعلیم کے ذریعے سکیولرازم کا بیج ہر مسلمان بچے

اورنوجوان کے دل میں بورہے ہیں جبکہ میڈیا ان کے قلبی کھیتوں پرآبپاشی کا کام کررہا ہے۔انہوں نے ترکی میں سکیولرازم کا کامیاب تجربہ بھی کرڈالا ہے۔

آج مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید کے باعث اکثرمسلمان سکیولرازم کی دلدل میں اپنی زندگی کو چلانے کی کوشش کررہے ہیں لہٰذاسکیولرازم خدااور قیامت کاانکارکروائے بغیرہی ہماری انفرادی واجتماعی زندگی میں تباہی ڈھارہاہے۔سکیولرطبقہ مذہبی تعلیمات کونافذ کئے بغیرمعاشرےکوصرف اپنی سوچ وفکر سے چلانے کے درپے ہوتاہے۔عملاً سکیولر ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ آج کئی مسلمان مذہب کو اپنی زندگی میں پارٹ ٹائم(Part-time) دیتے ہیں۔ہم اپنے بہترین اوقات،بہترین صلاحیتیں اور بہترین توانائیاں کاروبارِ زندگی چلانے میں صرف کردیتے ہیں لیکن مذہب کیلئے ہمارے پاس ٹائم نہیں ہے۔لوگ مکمل مذہبی زندگی بسر کرناروشن فکری کے خلاف تصورکرتے ہیں۔یہاں تک کہ مذہب ہماری زندگی کامتن بننے کے بجائے صرف حاشیہ بن کررہ گیاہے۔

کتابِ ھٰذامیں استادِمحترم سید جوادنقوی حفظہ اللہ نے''اسلام اورسکیولرازم''کےعنوان سے گفتگو کرکے مسلمانوں کوسکیولرازم کے سنگین خطرے کااحساس دلایاہےاوراس کے سدباب کیلئے راہِ حل بھی پیش کیا ہے۔اس بابت آپ نےنظریۂ سکیولرازم کےحقیقی خدوخال سے پردہ اٹھایاہے،اس کی بنیادکوواشگاف کرکے تاریخ کےآئینہ میں مسلمانوں کومستقبل کاعکس دکھایاہے،سکیولرازم کے بھیانک نتائج سے متنبہ کیاہےاورآگاہ کیاہے کہ آزادیٔ فکر،آزادیٔ رائے،آزادیٔ اظہار،آزادیٔ نفس اورحقِ خودارادیت کے بظاہر خوبصورت عناوین سے مزین لیکن بباطن پرفریب نظریۂ سکیولرازم کےطوفان میں مسلمان معاشرے بھی بری طرح گھر چکے ہیں۔سکیولرازم کانعرہ تو آزادی ہےلیکن یہ درحقیقت نظامِ الٰہی کی حاکمیت سے آزادی ہے۔استادِمحترم نے اس خطرے کا برملا اظہارکیاہے کہ دشمنانِ اسلام کی جانب سے''مذہب'' کو ناکافی و ناقابلِ اعتبارسمجھنے، اسے انسانی زندگی میں گوشہ نشینی کی حیثیت دینے اور ریاستی امور سے بے دخل کرنے والا یہ نظریہ منحرف عیسائیت کوشکست دےکراب''اسلام''کوتسخیرکرنے کےخواب دیکھ رہاہےلہٰذامسلمین کو بیدارہوکرسکیولرازم کا

مؤثر مقابلہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔آپ نے کتاب میں سیکولرازم کے علل واسباب اوران کا مسیحیت اور اسلام میں تقابلی جائزہ انتہائی جامع انداز میں پیش کیا ہے۔اس کتاب میں ان مفسد نظریات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جوسیکولرازم کے ہمراہ آتے ہیں نیز یہ کہ سیکولرازم کے طوفان کا رخ اب پاکستان کی جانب ہے لہٰذا سیکولرازم سے نبرد آزما ہونے کیلئے تمام مسلمین کو بیدار و کمر بستہ ہو جانا چاہئے۔

انسانی کاوشوں میں کمیوں،خامیوں اور نقائص کا امکان رہتا ہے لہٰذا قارئینِ گرامی سے گزارش ہے کہ کتاب میں موجود ایسی غلطیوں سے عفوو درگزر فرمائیں نیز ہمیں ان کی نشاندہی کریں تاکہ اگلے ایڈیشن میں ان کا ازالہ کیا جاسکے۔شکریہ

متاب پبلیکیشنز

فہرستِ مطالب

صفحہ

صفحہ

فصل چہارم:

صفحہ

صفحہ

صفحہ

فصل پنجم:

سکیولرازم کے ہمزاد مکاتب 161

صفحہ

فصل اول

سکیولرازم سے آشنائی کی ضرورت

سکیولرازم سے آگاھی کی اھمیت

کسی موضوع کی اہمیت وافادیت اسے سمجھنے میں انسان کی مدد کرتی ہے۔ اگر انسان کسی بھی موضوع کو اپنا موضوع جان کر اور اپنے سے متعلق قرار دے کر بیان کرے یا سنے تو نہ صرف سمجھ میں آتا ہے بلکہ انسان کو لذت بھی محسوس ہوتی ہے لیکن اگر کسی موضوع کو اجنبی اور بیگانہ جان کر سن رہا ہو تو نہ صرف لذت محسوس نہیں ہوتی بلکہ انسان کو کوفت، خستگی اور ملال بھی ہوتا ہے۔

جہاں تک فقط علمیت کا سوال ہے تو معلومات حاصل کرنے کے لئے بہت سارے دلچسپ موضوعات موضوعِ سخن بنائے جاسکتے ہیں، ان کی تعریف بیان کی جاسکتی ہے، ان کے متعلق دلائل دیئے جاسکتے ہیں اور ان کے بارے میں شبہات کا ازالہ کیا جاسکتا ہے لیکن زمانۂ حاضر اور موجودہ ملکی، فوجی، مذہبی، دینی اور عالمی صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے اس وقت ہمیں تعلیمات ومعلومات کی حد سے بڑھ کر بعض ایسے موضوعات میں دلچسپی لینے کی ضرورت ہے کہ جو نہ صرف علمی تشفی وتسلی فراہم کر کے ہماری علمی پیاس بجھا سکتے ہیں بلکہ ہمیں ایک عملی راستہ بھی بتا سکتے ہیں، جن موضوعات کا ہماری تقدیر، سرنوشت، بقاء اور انفرادی واجتماعی حیات سے تعلق ہے۔ یہ موضوعات لامحالہ اتنی اہمیت کے حامل ہیں کہ انہیں ترجیحاً ہر چیز سے پہلے بیان کیا جائے اور ان کے بارے میں بحث وگفتگو کی جائے۔

ان میں سے اہم ترین مسئلہ جو اس وقت ہمیں درپیش ہے اور جس کے متعلق اذہان روشن ہونا ضروری ہیں وہ سکیولرازم (Secularism) ہے۔ اس موضوع کے متعلق ہمیں سوچنے اور غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ سکیولرازم کے حقیقی خدوخال اور حقیقت سے آشنا ہو جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ سکیولرازم اپنے ساتھ کن کن فاسد امور کو انسانی زندگی میں داخل کر دیتا ہے کہ جن کا نتیجہ معاشرے کی تباہی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

سکیولرازم دورِحاضرکامسئلہ

سکیولرازم اس زمانے کے زندہ موضوعات میں سے ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس میں آج ہمارا معاشرہ مبتلا ہے اوراس کے مرحلے کو طے کرر ہا ہے۔ اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ کوئی قوم یا معاشرہ جب ایک مرحلے کو طے کرر ہا ہوتو اس دوران وہ بہت سارے مسائل کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، اسے احساس نہیں ہوتا کہ ہمارے ساتھ کیا بیت رہی ہے؟ کیا ہورہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ کون کررہا ہے؟ اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ اس کے نتائج کیا نکلیں گے؟ اور آخر کار ہم کہاں جا پہنچیں گے؟

یہ مراحل طے ہوجانے کے بعد جب حوادث رونما ہوجاتے ہیں تو بعد میں لوگ بیٹھ کر ان مسائل کے متعلق گفتگو کرتے ہیں کہ کیا ہوا؟ کیا نہیں ہوا؟ لیکن حوادث رونما ہونے کے بعد اتنی طویل مدت گزر چکی ہوتی ہے کہ اب اس کے متعلق گفتگو سوائے کفِ افسوس ملنے، اظہارِ افسردگی، سرگرمی اور مشغولیت کے کچھ بھی نہیں ہوتی۔

کسی شے کے متعلق گفتگو اس کی حقیقت کو سمجھنے، اس کے خطرات ونقصانات اور آثار ونتائج سے آگاہ ہونے کا بہترین موقع وہی ہوتا ہے جن دنوں وہ حالتِ وقوع میں ہو۔ انہی دنوں میں اس کے متعلق گفتگو کرنا بھی بہت مشکل کام ہوتا ہے چونکہ ابھی وہ کھل کر سامنے نہیں آیا ہوتا، اس کا پورا چہرہ نمایاں نہیں ہوتا بلکہ کچھ حصہ زمین کے اندر اور کچھ زمین کے باہر ہوتا ہے۔

پس سکیولرازم موجودہ دور کا زندہ موضوع ہے اور آج کل ہمارے معاشرے میں حالتِ وقوع میں ہے لہٰذا اس سے آشنائی کی اشد ضرورت ہے۔

اپنے زمانے کا انسان

روایات، بالخصوص سیرتِ معصومین علیہم السلام اور بالاخص واقعۂ کربلا کے دروس میں سے ایک درس یہ ہے کہ اگر آپ اہمیت دینا چاہتے ہیں، اگر اہتمام کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ میں ہمت ہے تو اپنے زمانے کے

مسائل کو اہمیت دیں اور اپنے زمانے کے مسائل میں اہتمام کریں، آپ اپنے زمانے وعصر کے فرد و معاصر خود بنیں۔ تاریخ اور ماضی میں زندگی بسر نہ کریں اور ایسے ہی مستقبل کے خیالوں میں کھوئے ہوئے نہ رہیں یعنی ماضی کی تاریکیوں اور ظلمات اور مستقبل کے افسانوں وتخیلات میں زندگی بسر نہ کریں۔

سلیم بن قیس نے امیر المومنین علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث بیان کی:

وَاِنَّ أَشَدَّ أَهْلِ النَّارِ نِدَامَةً وَحَسْرَةً رَجُلٌ دَعَا عَبْدًا اِلَى اللّٰهِ فَاسْتَجَابَ لَهُ وَقَبِلَ مِنْهُ فَأَطَاعَ اللّٰهَ فَأَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ وَأَدْخَلَ الدَّاعِيَ النَّارَ بِتَرْكِهِ عِلْمَهُ وَاتِّبَاعِهِ الْهَوٰى وَطُوْلِ الْاَمَلِ، أَمَّا اِتِّبَاعُ الْهَوٰى فَيَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ وَطُوْلُ الْاَمَلِ يُنْسِي الْاٰخِرَةَ....... [1]

جہنمیوں میں سب سے زیادہ ندامت اور حسرت کرنے والا وہ شخص ہوگا کہ جو دوسرے کو اللہ کی طرف بلائے اور وہ اس کی دعوت پر لبیک کہہ کر اللہ کی اطاعت کرے اور خدا بھی اسے جنت میں داخل کرے لیکن خود دعوت دینے والے کو اللہ تعالیٰ جہنم میں ڈالے اس لئے کہ اس نے اپنے علم پر عمل نہیں کیا، خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کی اور لمبی لمبی آرزوئیں کرتا رہا۔ خواہشاتِ نفسانی انسان کو حق کی پیروی سے روک دیتی ہے اور لمبی لمبی آرزوئیں آخرت کو بھلا دیتی ہیں۔

اسی طرح حضرت امام علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

أَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ اثْنَانِ: اِتِّبَاعُ الْهَوٰى وَ طُوْلُ الْأَمَلِ فَأَمَّا اتِّبَاعُ الْهَوٰى فَيَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ وَ أَمَّا طُوْلُ الْأَمَلِ فَيُنْسِي الْاٰخِرَةَ...... [2]

اے لوگو! مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ دو باتوں کا ڈر ہے۔ ایک خواہشوں کی پیروی اور دوسری امیدوں کا پھیلاؤ۔ خواہشوں کی پیروی وہ چیز ہے جو حق سے روک دیتی ہے اور امیدوں کا پھیلاؤ

---

[1]......(الکافی-الکلینیؒ، باب: استعمال العلم، الجزء ۱، صفحہ ۵۸) [2]......(نہج البلاغہ، خطبہ ۴۲)

آخرت کو بھلا دیتا ہے......

نہج البلاغہ، خطبہ ۲۸ میں بھی امیر المومنین علیہ السلام نے لوگوں کے بارے میں اسی خوف کا اظہار کیا ہے۔ زندگی کے لئے لمبی لمبی آرزوئیں یعنی خیالی پلاؤ بنانا اور پھر ان مستقبل کی آرزوؤں میں ہی اپنی ساری عمر صرف کر دینا کہ جن تک انسان اپنی عمر میں ہرگز نہیں پہنچ سکتا، تباہی کا باعث ہے لہٰذا ماضی اور مستقبل کی بجائے زمانۂ حاضر کو اہمیت دینی چاہیئے۔ ہاں ماضی اگر مستقبل کے راستے بتانے کیلئے ایک منبع ہے تو پھر ماضی میں بھی غور کرنا چاہیئے، ماضی کو عبرت کا ایک منبع سمجھ کر پڑھنا چاہیئے تاکہ جس زمانے میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے لئے ماضی سے کچھ حاصل کر سکیں۔ پس اپنے زمانے کے مسائل کی آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

نہج البلاغہ میں ہے کہ حضرت کے اصحاب میں سے ایک شخص نے سوال کیا:

كَيفَ دَفَعَكُمْ قَوْمُكُمْ عَنْ هٰذَا الْمَقَامِ وَ أَنْتُمْ أَحَقُّ بِهِ...... [1]

کیا وجہ ہے کہ لوگوں نے آپ کو اس منصب سے الگ رکھا حالانکہ آپ اس کے زیادہ حق دار تھے۔

تو آپ علیہ السلام نے فرمایا:

فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: يَا أَخَا بَنِيْ أَسَدٍ اِنَّکَ لَقَلِقُ الْوَضِيْنِ تُرْسِلُ فِيْ غَيْرِ سَدَدٍ......وَدَعْ عَنْکَ نَهْبًا صِيْحَ فِيْ حَجَرَاتِهِ......

اے برادر بنی اسد! تم بہت تنگ حوصلہ ہو اور بے راہ ہو کر چل نکلے ہو......چھوڑو اس لوٹ مار کے ذکر کو کہ جس کا چاروں طرف شور مچا ہوا تھا......

وَ هَلُمَّ الْخَطْبَ فِي ابْنِ أَبِيْ سُفْيَانَ......

اب تو اس مصیبت کو دیکھو کہ جو ابوسفیان کے بیٹے کی وجہ سے آئی ہے......

---

[1]......(نهج البلاغه، خطبه/ ١٦٠)

اس شخص نے آپ علیہ السلام کے سامنے چند شخصیات کے نام لئے اور کہا کہ ہمیں بتایئے کہ آپ کے ساتھ ان کے ہاتھوں کیا ہوا؟ اور آپ نے کیا کیا؟ حضرت کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور غصہ آیا۔ ناگواری کے عالم میں آپ نے اس شخص کو کھلے الفاظ میں ڈانٹ بھی دیا کہ تیرا اور کوئی کام نہیں ہے؟ تیرے اپنے زمانے کے مسائل نہیں ہیں؟ تیری اپنی کوئی مشکلات نہیں ہیں؟ آیا تو نہیں دیکھتا کہ اس وقت ابوسفیان کا بیٹا کس قدر اسلام کے لئے خطرہ بنا ہوا ہے؟ آیا تو نہیں دیکھتا کہ آئے دن ہماری ایک ولایت، ایک ایک صوبہ ہمارے ہاتھوں سے نکل کر دشمنوں کے ہاتھوں میں جا رہا ہے؟ آیا تو نہیں دیکھتا کہ تیرے زمانے میں لوگوں میں دین داری اور دین کی طرف رغبت کم ہوتی جا رہی ہے؟ آیا تو نہیں دیکھتا کہ لوگوں کی توجہ دنیا کی طرف زیادہ ہوتی جا رہی ہے؟ یہ تیرے زمانے کے مسائل ہیں۔ ابوسفیان کا بیٹا اس وقت جو کچھ انجام دے رہا ہے وہ تیرے زمانے کے مسائل ہیں یعنی میری خلافت میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ تیرے زمانے کے مسائل ہیں۔

رحلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو پچیس سال بعد خلافت ملی تو پچیس سال پہلے کی باتیں امیر المومنین علیہ السلام کے نزدیک اس شخص کے زمانے کی باتیں نہیں تھیں جس کو کہا گیا کہ تم اپنے زمانے کی سوچ سوچو اور اپنے زمانے کے بارے میں غور کرو۔ یعنی اگر میں تجھے بتا بھی دوں کہ میرے ساتھ کیا ہوا تو تیری آج کی کون سی مشکل حل ہوگی؟ اگر اس کے بتانے سے تیری آج کی مشکل حل ہوتی تو میں بتا دیتا لیکن اگر تو فقط سرگرمی کے لئے پوچھنا چاہتا ہے تو اس سے بہتر ہے کہ اپنے زمانے کے مسائل کے بارے میں غور کر، تیرے زمانے میں مسائل کہیں زیادہ بڑے ہیں۔

ایک اور حدیث حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

اَلْعَالِمُ بِزَمَانِهِ لَا تَهْجُمُ عَلَيْهِ اللَّوَابِسُ......[1]

---

[1]...... (اصولِ کافی-الکلینیؒ، الجزء۱، صفحہ ۲۹۰) (مرآة العقول فی شرح أخبار آل الرسولؐ- العلامة المجلسیؒ، الجزء۸، صفحه ۲۴۴)

اپنے زمانے کے عالم پر کبھی بھی شبہات وشکوک حملہ آور نہیں ہوسکتے، وہ ان سے مغلوب نہیں ہوسکتا، شکست نہیں کھا سکتا لیکن جو اپنے زمانے سے غافل ہے اور ماضی کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے مثلاً اس کو پتا ہے کہ مغلیہ دور کیسے تھا؟ عباسی زمانہ کیسا تھا؟ اس طرح عثمانی خلافت کے بارے میں سب کچھ پتا ہو لیکن اس کو یہ معلوم نہ ہو میرے زمانے میں کیا ہو رہا ہے تو ایسا شخص جلدی شبہات کے نرغے میں آجاتا ہے۔

امامؑ فرماتے ہیں کہ جو اپنے زمانے کا عالم نہ ہو وہ ہمیشہ اپنے زمانے میں مغلوب ہوتا ہے۔ اپنے زمانے میں ایسا شخص جس پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہوں اور وہ ان حملوں کی تاب نہیں لاتا ہو تو راستے اس پر مدہم پڑ جاتے ہیں، اس کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ میں اپنی زندگی میں کدھر جاؤں، اس طرح وہ ایک سرگردان انسان بن جاتا ہے کہ اسے چاروں طرف اندھیرا نظر آتا ہے لیکن جو اپنے زمانے سے آشنا ہو، اپنے زمانے کو سمجھتا ہو، اپنے زمانے کا انسان ہو وہ ان حملوں سے نجات پا سکتا ہے۔ اگر ہم زمانے سے پیچھے رہ گئے تو اس وقت زمانے والے اتنے قہار و جبار ہیں کہ ہمیں پیچھے چلنے کی مہلت بھی نہیں دیں گے۔

اس زمانے میں جنگل کا قانون نافذ ہے لہٰذا جو تھک گیا وہ ہار گیا، جو ستانے بیٹھ گیا تو سمجھو کچلا گیا۔ اس کو زندگی کا حق نہیں ہے، جنگل میں کمزوروں کو زندگی کا حق نہیں ہوتا، کمزور طاقتوروں کا لقمہ ہوتا ہے لہٰذا زمانے سے پیچھے رہنا خودکشی ہے۔ اگر کوئی ملک، قوم، معاشرہ و مذہب زمانے سے پیچھے رہ جائے تو گویا اس نے خودکشی کی ہے۔ اس چلتے کارواں سے پیچھے نہیں رہنا بلکہ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے۔

موجودہ نسل کیلئے اپنے زمانے کے مسائل چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا ان کے بارے میں سوچیں اور ان کا راہ حل تلاش کریں۔ ہمیں اپنے زمانے میں زندگی بسر کرنی ہے لہٰذا اپنے زمانے کے مسائل کو سمجھنے کی حد تک کم از کم ہمیں ان مسائل کو ضرور چھیڑنا چاہئے۔ اگر ہم خوش ہوتے ہیں کہ متمدن مترقی اور پیش رفتہ زمانے میں موجود ہیں اور اپنے آباؤ اجداد پر افسوس ہوتا ہے کہ وہ کتنے سادہ زمانے میں زندگیاں بسر کر کے چلے گئے ہیں تو شاید معاملہ برعکس ہو۔ شاید وہ خوش قسمت اور ہم بدقسمت ہوں کہ وہ سادہ زمانے گزار گئے اور ہم ایک پیچیدہ زمانے میں ہیں۔ اس لئے کہ سادہ زمانے میں انسان کی ذمہ داریاں بھی بہت سادہ ہوتی ہیں، سادہ

زمانے کے مسائل ومشکلات بھی بہت سادہ ہوتی ہیں اور راہِ حل بھی بہت سادہ ہوتے ہیں لیکن جب زمانہ پیچیدہ ہوجائے تو اس مترقی زمانے میں انسان کو ایک مترقی ذہن کے ساتھ زندگی بسر کرنا پڑتی ہے جسے ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ انسان کو اَپ ٹو ڈیٹ(Up-to-date) ہونا چاہئے۔صرف پینٹ پہننے، گھر کی چھت پر ڈش انٹینا لگانے، کمپیوٹر خریدنے یا انٹرنیٹ کنکشن لے کر فحاشی کے مناظر دیکھ کر انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اپ ٹو ڈیٹ(Up-to-date) ہوگیا ہوں۔اسے کبھی نہیں کہہ سکتے کہ آپ زمانے کے ساتھ ہم آہنگ اور اس زمانے کی نسل ہیں۔اگر آج کی نسل ہیں تو مترقی اور پیچیدہ زمانے میں آپ کو مترقی ذہنیت بنانی پڑے گی۔

اس صنعتی زمانے کی بنی ہوئی مصنوعات کا گھر میں ڈھیر لگانے سے انسان اپ ٹو ڈیٹ (Up-to-date) نہیں ہوجاتا، بنگلہ بنانے سے انسان کبھی اپ ٹو ڈیٹ نہیں ہوتا بلکہ ان بنگلوں میں آپ کو بہت رجعت پسند ترین انسان ملیں گے، شاید جھونپڑوں میں رہنے والے اپ ٹو ڈیٹ(Up-to-date) ہوں۔صرف اپنے اردگرد وسائل اکٹھے کرلینے، صرف جاپان، جرمنی اور امریکہ کی فیکٹریوں کا بنا ہوا سامان اپنے گھروں میں رکھنے سے تو انسان آج کے زمانے کا فرد نہیں بن جاتا یا چند زبانیں سیکھ لینے مثلاً انگریزی کے چند الفاظ زبان پر جاری کرلینے سے انسان اپنے زمانے کا انسان نہیں بنتا۔انگریز تو قرونِ وسطیٰ میں بھی انگریزی بولتا تھا لہٰذا انگریزی بولنے سے انسان آج کے زمانے کی نسل نہیں بن جاتا۔درحقیقت انسان کو جو چیز اپنے زمانے کا انسان بناتی ہے وہ یہ مسائل نہیں بلکہ وہ انسان کی سوچ، نظریہ اور آئیڈیالوجی ہے جو بتاتی ہے کہ یہ کس زمانے کا انسان ہے۔

بعض واقعات اس زمانے سے تعلق نہیں رکھتے لیکن بعض لوگ ذہنی طور پر دوسو سال لیٹ آتے ہیں۔وہ فقط جسمانی طور پر اس صدی میں ہوتے ہیں۔اگر ہم ذہنی اور روحی طور پر اس صدی میں ہیں تو ہمیں اس زمانے کے متعلق سوچنا ہوگا اور اس کے مطابق آگے بڑھنا ہوگا۔سیکولرازم جیسے تباہ کن مسائل سے غافل رہنا پسماندگی کی علامت ہے۔

اپنے زمانے کا پیشوا ہونا

ایک وہ زمانہ تھا جب ہمارا مذہب ومکتب زمانے سے بہت آگے تھا اور دوسروں کا پیشوا ورہنما تھا۔ دوسرے ہم سے بہت پیچھے تھے مثلاً آج یہی یورپ جو ہمیں بہت آگے اور اپنے لئے قبلہ نظر آتا ہے بہت پیچھے تھا۔ یہاں سے بچی کھچی کوئی چیز ان کو نصیب ہوتی تو اس پر اس طرح ٹوٹ پڑتے تھے جس طرح آج مسلمان یورپ کے بچی کھچی چیز پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔آج جو ہماری حالت ہے وہ کل ان کی تھی۔ اگر ایک مسلمان دانشور کا جملہ یورپ میں ترجمہ کر کے بیان کیا جاتا تھا تو وہ مہینوں وجد میں رہتے تھے جبکہ آج ہم ایک انگریز کا نام سن کر سالوں وجد میں رہتے ہیں۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ جب دین کے عقائد کے متعلق کسی کے شبہ ڈالنے سے پہلے اس زمانے کے علماء شک کا جواب پہلے ہی دے دیتے تھے اور اس کا راہِ حل بھی بیان کر دیتے تھے۔اس لئے اس زمانے میں مسلمان سرفراز تھے اور ہر میدان میں اسلام کا پرچم بلند تھا۔

یہ بہت اہم بات ہے کہ مشکل سر اٹھانے سے قبل اس کا راہِ حل موجود ہو۔ درحقیقت دین اسی چیز کا نام ہے۔ خداوند تبارک وتعالیٰ نے انسان کی خلقت سے بہت پہلے ہدایت نازل کی چونکہ جب انسان زندگی شروع کرے گا تو اسے مشکلات پیش آئیں گی لہٰذا مشکلات پیش آنے سے قبل راہِ حل بیان کیا۔

پس انسان کا ایسے مکتب ومذہب سے تعلق ہو کہ جو مشکل کھڑی ہونے سے پہلے راہِ حل بتا دیتا ہے۔ پھر اگر ہمارے زمانے میں مشکلات پیش آئیں اور ہم سب حیران وسرگرداں ہوں کہ راہِ حل کیا ہے تو یہ مذہب سے دوری کا نتیجہ ہے۔ یہ جان بوجھ کر اپنے اوپر راستے کو مبہم بنانا ہے جیسے کہ بچہ اپنے ماں باپ کو محظوظ کرنے کے لئے کبھی نابینا کا کردار ادا کرتا ہے۔

اگر بچے نابینا کا کردار ادا کریں تو انسان محظوظ ہوتا ہے لیکن جب بالغ اور عاقل انسان اور پوری قوم دوسروں کو محظوظ کرنے کے لئے نابینا ہو جائے تو انسان نہ صرف محظوظ نہیں ہوتا بلکہ افسوس ہوتا ہے اور یہ ان کے لئے تباہی کا باعث ہے۔ ہمارے مکتب میں مشکلات سے پہلے راہِ حل موجود ہے اور اس کی بہترین دلیل اتفاقاً

ہمارے ہی خطے میں ہے، وہ یہ کہ رہبر معظم انقلابِ اسلامی حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی نے فخر کے ساتھ بیان فرمایا کہ ایک زمانے میں برصغیر (جب پاکستان اور ہندوستان ایک تھا) اتنا پیشرو تھا، تفکر وعقائد میں اتنا ترقی یافتہ تھا کہ پوری دنیا کے مسائل کا حل بیان کرتا تھا۔

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ میر سید حامد حسین اعلیٰ اللہ مقامہ جو تیرہویں صدی ہجری کے بزرگ علماء میں سے تھے، سرزمین ہندوستان و برصغیر کا عظیم علمی سرمایہ تھے۔ان کی معروف کتاب ''عبقات الانوار'' ہے جو انہوں نے ''الغدیر'' سے پہلے لکھی ہے بلکہ ''الغدیر'' کے منابع میں سے ہے۔

عبقات الانوار تاریخ تشیع میں ایک بے نظیر کتاب ہے۔ آپ نجف جائیں جہاں بڑے بڑے حوزے اور علمی مراکز گزرے ہیں حتیٰ مشہد، قم، حلّہ یا دیگر کسی مقام پر اتنا بڑا علمی کارنامہ انجام نہیں پایا جتنا سر زمین ہندوستان پر انجام پایا۔عبقات الانوار وہ کتاب ہے جو تحفہ اثنا عشریہ کے رد میں لکھی گئی ہے لیکن تحفہ اثنا عشریہ کے چھپنے اور بازار میں آنے سے پہلے میر سید حامد حسین کی کتاب بازار میں آئی تھی۔

جب مخالفین نے شیعہ عقیدتی سرحدوں پر حملہ کیا اور تحفۂ اثنا عشریہ کے مؤلف نے شیعوں کے خلاف کتاب لکھنی شروع کی تو اس سے پہلے کہ یہ کتاب تدوین کے مرحلہ سے فارغ ہو کر چھپ کے سامنے آتی، اس کا جواب (عبقات الانوار) پہلے چھپ کر بازار میں آ گیا اور لوگوں کے پاس موجود تھا حتیٰ یہاں تک لکھا گیا ہے کہ اس کتاب (تحفہ اثنا عشریہ) کا مؤلف اس درد میں اسی سال مر گیا۔ اس کو یہی افسوس تھا کہ اس سے پہلے کہ میں اپنی کتاب بازار میں لاتا، اس کا جواب پہلے آ گیا۔

یہ ہے اپنے زمانے پر مقدم ہونا، اپنے زمانے کا پیشوا ہونا لیکن آج اس قوم اور اس مسلک بلکہ پورے اسلام کی حالت یہ ہے کہ اسلام کے خلاف ہونے والے اقدامات، سازشیں، شبہات، اعتراضات اور سوالات سالوں گردش کرتے رہتے ہیں لیکن ان کا جواب اور راہِ حل نہیں آتا۔ مشکلات پر مشکلات پڑتی ہیں، ایک مشکل سے دوسروں مشکل جنم لیتی ہے لیکن نہ پہلی مشکل کا حل سامنے آتا ہے نہ دوسری کا۔

آج واقعتاً ہم ذہنی لحاظ سے پسماندگی کا شکار ہیں اس وجہ سے شبہ ڈالنے والے پہل کر جاتے ہیں اور

جواب دینے والے مدتوں سرگرداں و حیران ہوکر صرف افسوس کرتے رہتے ہیں۔صرف ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر گلے شکوے کرنے سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ ہمیں چاہئے کہ اپنے زمانے کے مسائل کا حل تلاش کریں، اپنے زمانے میں دین کا دفاع کریں، اپنے زمانے میں دین کو تحفظ دیں اور یہی کربلا کا سب سے اہم ترین درس بھی ہے کہ اپنے زمانے کے پیدا ہونے والے حملات اور شبہات کا جواب دو۔

ماضی میں بہت سے علماء آئے جنہوں نے اپنے زمانے میں عظیم علمی خدمات انجام دیں اور حق ادا کیا مثلاً شیخ طوسی رضوان اللہ علیہ کے زمانے میں مذہب پر شدید ترین حملے ہوئے لیکن شیخ طوسیؒ نے جوانمردی سے ان کا مقابلہ کیا اور منہ توڑ جواب دیئے کہ آج ہزار سال گزرنے کے بعد بھی شیخ طوسیؒ کی علمی خدمات زندہ ہیں۔ ہزار سال پہلے کے سوالات اور شبہات کے جوابات آج ہمارے لئے بہت بڑا علمی سرمایہ ہیں۔

لہٰذا کربلا کا سب سے بڑا درس یہی ہے کہ اگر تم اپنے زمانے کے مسائل، مشکلات، حملوں اوراعتراضات کو نظر انداز کروگے تو زمانے کے ہاتھوں پیس دیئے جاؤ گے۔

قوم کا حق نہیں بنتا کہ وہ اپنے زمانے کے ساتھ قدم ملا کے نہ چلے بلکہ ہمیں تو یہ حکم دیا گیا ہے:

وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًاo......[1]

اور ہمیں متقین کا پیشوا بنادے......

یعنی مسلمانوں کو پیش رفتہ ترین، ترقی یافتہ ترین ملت بنادے تاکہ دوسرے ان کے پیچھے چل پڑیں۔ یہ قرآن کا نعرہ و دستور ہے کہ تم زمانے سے آگے بڑھ جاؤ اور اپنے زمانے کے پیشوا بنو۔

سکیولرازم، سیلابی ریلہ

اگر ہم زمانے کے پیشوا بن کر حرکت کریں تو حالات ہمارے قابو میں ہوں گے ورنہ ان کا مقابلہ

---

[1]......(سورۃ الفرقان/ ٧٤)

کرتے کرتے حالات کے ہاتھوں انسان نابود ہو جاتا ہے۔اس لئے کہ حالات کا مقابلہ کرنے کے معانی یہ ہیں کہ مثلاً ایک بہت بڑا پتھر اوپر سے گرے تو آپ اسے نیچے سے ہاتھ رکھ کر سہارا دے دیں لیکن آپ کافی عرصہ تک اس پتھر کو روکے ہوئے کھڑے رہیں تو ایک وقت آئے گا کہ آپ کے ہاتھ، پاؤں اور اعضاء و جوارح تھک جائیں گے اور یہی پتھر جو آپ نے روکا ہوا ہے اسی کے بوجھ تلے دب کر مر جائیں گے۔حالات کا مقابلہ یعنی ایک بہت بڑی چٹان کو کچھ مدت کے لئے روکے رکھنا۔

انسان کو حالات سے بہت آگے سوچنا چاہئے۔ جو حالات سے پیچھے رہ جائیں اور دوسرے ان پر حالات کو ٹھونسیں پھر یہ ان حالات کے مقابلے میں آجائیں، حالات کا دفاع کریں اور ساری عمر اس میں صرف کریں تو پھر بھی بچنے کا امکان کم ہے۔

حالات، سیلاب کی طرح جان لیوا و تباہ کن ریلے کی مانند ہیں۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ سیلاب کے ریلے کا مقابلہ کرنے میں کتنے لوگ کامیاب ہوتے ہیں؟ زلزلے کا کتنے ملکوں نے مقابلہ کیا اور کتنے افراد نے نجات پائی؟ اگر سیلاب اور زلزلوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے پھر تو ٹھیک ہے ہم بھی حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ حالات زلزلے اور سیلاب کی طرح آتے ہیں اور ویران کر کے چلے جاتے ہیں لہٰذا حالات کے پیش آنے سے پہلے ان کی روک تھام کی کوشش کرنی چاہئے لیکن حالات سے آگے بڑھنے کے لئے کیا اقدامات؟ کیا افکار اور کون سا راستہ طے کرنا ہے؟ حالات پر قابو پانے کیلئے برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھنا ہے البتہ اس کے لئے خاص راستہ، خاص وسائل اور خاص اوزار ہیں اور ان ہی کے ذریعے ہم حالات سے آگے جاسکتے ہیں۔ اس وقت میڈیا نے دنیا میں جو زلزلہ ایجاد کیا ہے آپ کسی ری ایکٹر اسکیل پر اس کے درجہ کی پیائش نہیں کر سکتے، یہ جس پیمانے پر اٹھا ہے اور جن وسائل کو بروئے کار لا کر ساری انسانیت کو نیست و نابود کر رہا ہے آپ اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ کتنا ویران کن ہے۔

ہم لوگ نعرہ لگاتے ہیں کہ ہم حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ وہ قوم میڈیا کا مقابلہ کرنے کا سوچ رہی ہے جس کے پاس ایک سالانہ، ششماہی یا سہ ماہی مجلّہ بھی نہیں ہے، ہفت نامہ یا روزنامہ کی تو بات ہی نہ کریں۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں......[1]

پانی کے سیلاب سے پھر بھی جان بچائی جاسکتی ہے لیکن اس سیلاب سے جان بچانا مشکل ہے۔ یہ بہت تباہ کن سیلاب ہے جس کی ہولناک لپیٹ میں معاشرے آئے ہوئے ہیں۔ ان کا حشر دیکھیں کہ کس طرح تہہ وبالا کردیا ہے۔ یہ زلزلے اور سیلاب ایسا نابود کرتے ہیں کہ کئی سوسال تک کھنڈرات میں بھی ان کے آثار نہیں ملیں گے۔

آج دینی مقدسات کے خلاف نظریات، افکار، انحرافات، گمراہیوں اور فساد وفحشا کا نامقدس سیلاب امڈ آیا ہے اور اپنے اندر سب کچھ بہالے جارہا ہے۔ ایسے میں ہم ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر کہیں کہ یہ کسی پیش نماز یا فلاں مولانا، مدرسہ ومسجد کا فریضہ ہے تو یہ وہی کفِ افسوس ملنا اور اپنی آنکھیں بند کرنا ہے۔

آپ ان دوسوچوں کو موازنہ کریں کہ ہمارے بارے میں کیا سوچا جارہا ہے اور ہم اپنے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟ ان دوسوچوں میں کتنا فرق اور فاصلہ ہے؟ کتنی بجلیاں ہیں جو تمہارے آشیانے جلانے کے لئے بیتاب ہیں اور ان کے پاس بقدر کافی وسائل بھی موجود ہیں۔ اس وقت دشمن کا اہم ترین حربہ دین اور دیانت کے خاتمہ کے لئے ہے کہ انہیں کرہ ارض سے ختم کردیا جائے۔ دین کو ایسی منفور چیز بنادیا جائے کہ دیندار خود دین کو اپنی زندگی سے نکالنے کا مطالبہ کرے۔ اہم ترین حربہ یہی سکیولرازم ہے اور سکیولرازم کا یہ ریلہ اب ہمارے ملک میں آپہنچا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ یہ کتنی تباہی مچاکے آگے جائے گا۔

تاریخ، مستقبل کا آئینہ

جب سے انسان نے صفحۂ ہستی پر قدم رکھا ہے اس وقت سے آج تک انسانی اذہان کی کاوشوں سے

---

[1]......(دیوان غالب، صفحہ ۹۱)

مختلف اور متعدد افکار و آراء وجود میں آئے ہیں، بعض بہت ہی ناتوان اور ضعیف و کمزور تھے کہ جن کے اندر کوئی فکری، نظریاتی اور علمی قوت نہیں تھی کہ اپنے آپ کو چند سالوں کے لئے بچاسکیں، وہ ذہن میں کسی خیال کی طرح آ کر گزر گئے اور تاریخ کا حصہ بن گئے لیکن بعض آراء اور نظریات کو دوام ملا۔ انہیں اتنی فرصت ملی کہ وہ عرصہ حیات میں کچھ مدت تک باقی رہے اور ایک معین مدت تک رہنے کے بعد وہ بھی تاریخ کا حصہ بنے۔

جو کچھ تاریخ کا حصہ بنا ہے اسے جاننا بہت ضروری ہے، نہ صرف معلومات کی حد تک بلکہ اس لئے کہ تاریخ اور ماضی انسان کی اجتماعی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ ماضی فخر ومباہات اور غرور و تکبر کا سامان نہیں ہے، صرف انسان کو سرگرم کرنے اور الجھانے کا میدان نہیں ہے اسی طرح فقط معلومات کا خزانہ و مخزن نہیں ہے۔ اگر فقط اسی حد تک تاریخ سے ہمارا تعلق ہو تو یہ صرف قصہ اور کہانی کی حد تک ہے۔

لیکن اگر تاریخ سے مستقبل کی راہیں نکلتی ہوں، ماضی کے تجربات سے انسان کو عبرت حاصل ہوتی ہو، اگر ماضی انسان کے مستقبل کے لئے چراغ اور راہنما بن جائے تو اس وقت تاریخ انسان کے لئے ایک بہت بڑی درسگاہ ہے۔ یہ انسان کے لئے ایک مدرسہ، آموزشگاہ اور یونیورسٹی ہے کہ جس سے انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔

لہٰذا تاریخی افکار اور نظریات کی اہمیت اس بات سے عیاں ہو سکتی ہے کہ ان میں دلچسپی لے کر اپنے حال اور مستقبل کے لئے، موجودہ اور آئندہ نسل کے لئے کوئی راہ حل تلاش کرسکیں، اس کے مسائل کے لئے کوئی چارہ جوئی کرسکیں تا کہ اس کی فکری اور نظریاتی راہنمائی کرسکیں۔ تاریخ اور گذشتہ نسل فقط اترانے اور فخر و مباہات کے لئے ہو تو یہ کافی نہیں ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

مَنْ أَبْطَأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ......[1]

جسے عمل پیچھے ہٹائے اسے نسب آگے نہیں بڑھا سکتا......

---

[1]......(نہج البلاغہ، حکمت ۳۸۹)

وَ فِیُ رِوَایَۃٍ أُخُریٰ : مَنُ فَاتَہٗ حَسَبُ نَفُسِہٖ لَمُ یَنُفَعُہٗ حَسَبُ آبَائِہٖ......[1]

دوسری روایت میں اس طرح ہے: جسے ذاتی شرف ومنزلت حاصل نہ ہوا سے آباؤ اجداد کی منزلت کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

لہٰذا اگر کسی قوم وقبیلہ کی بساط میں فقط اپنے اسلاف کی بوسیدہ ہڈیوں کے علاوہ کچھ نہ ہوتو وہ زیادہ دیر زمانے کے ہمراہ نہیں چل سکتے ،ان کی عمر دراز نہیں ہوسکتی۔

خود انسان کے اپنے اعمال اور اپنے اوصاف ہی اسے کسی مقام تک پہنچا سکتے ہیں لہٰذا ہمیں نسلِ حاضر اور نسلِ مستقبل کے متعلق سوچنا ہے۔نسلِ ماضی جو اپنی عمر گزار چکی ہے اگر ہم ان کے بارے میں سوچیں بھی تو ہماری سوچ نہ ہمارے کام آسکتی ہے نہ ان کے اگر چہ ممکن ہے ہمارے اعمال برزخ میں ان کے کام آئیں لیکن ہماری سوچ ان کے کام ہرگز نہیں آسکتی۔

جس طرح انسانوں کی نسلیں ہیں اسی طرح افکار ونظریات کی بھی نسلیں ہیں۔ہمیں افکار ونظریات کی موجودہ نسل کے متعلق سوچنا ہے لیکن اگر گزشتہ نسل کے افکار میں سوچنے سے مستقبل کا راستہ دکھائی دیتا ہے تو اس میں بھی غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔وہ نظریات وافکار جو آج تاریخ کا حصہ ہیں بہت زیادہ ہیں از جملہ کمیونزم کہ عنقریب اس کا خاتمہ ہوا اور تاریخ کا حصہ بنا۔اب اگر کمیونزم کے متعلق گفتگو سے مستقبل کی راہ نکلتی ہے اور بہت ساری عبرتیں حاصل ہوتی ہیں تو اس پر بحث کرنی چاہیئے ورنہ اس پر بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ یہ ایسے ہے کہ جیسے آپ ایک طوفانی سمندر کے درمیان میں ہوں جہاں بڑی بڑی لہریں اٹھ رہی ہوں اور آپ وہاں بیٹھ کر ایسے لوگوں کی باتیں کررہے ہوں جو ایک ہزار سال پہلے کسی طوفان میں گرفتار ہوگئے تھے،اب جب کہ آپ خود گرفتار ہوگئے ہیں عین اسی لمحہ گفتگو شروع کریں کہ دو ہزار سال پہلے کسی خطے میں طوفان پیدا ہوا اور اس میں کچھ لوگ گھر گئے اور آخر کار کچھ بچ بھی گئے۔وہ جو بچ گئے انہوں نے کیا کیا تھا؟

---

[1]......(نہج البلاغہ، حکمت ۳۸۹)

اگر یہ گفتگو آپ کو موجودہ طوفان سے بچانے کے قابل ہے تو پھر آپ اس میں دلچسپی لیں لیکن اگر یہ گفتگو فقط آپ کا وقت ضائع کر رہی ہو تو پھر بہتر ہے کہ آپ اپنی موجودہ صورتِ حال پر غور کریں، اپنی چارہ جوئی کریں، سوچیں کہ اب جس الجھن میں پھنس گئے ہیں اس سے کیسے نجات پائیں؟ ورنہ ہلاک ہو جائیں گے۔

سکیولرازم دورِ حاضر کی ایک الجھن ہے جس میں بہت سارے لوگ گرفتار ہو گئے ہیں اور آئندہ بھی ہوں گے۔ یہ دورِ حاضر کا سمندری طوفان ہے۔ یہ فقط تاریخ کا حصہ نہیں بلکہ ایک زندہ موضوع ہے۔

سکیولرازم، تباہ کن فلسفہ حیات

حیاتِ بشری کے متعلق گونا گوں آراء، افکار، نظریات اور فلسفے گزر رہے ہیں لیکن اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ اس وقت اس نسلِ حاضر کے سامنے جو فلسفہ حیات بنام سکیولرازم موجود ہے یہ بہت ہی مہلک اور تباہ کن ہے۔ یہ انسانی تہذیب اور اسلامی تمدن کو صفحۂ ہستی سے مٹا کے رکھ دے گا اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ انسانی ہاتھ کی بنی ہوئی جدید مصنوعات کا ماحولیات پر منفی اثر کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اسی طرح یہ صنعت جس سے انسانیت کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے اپنے عروج پر ہے۔

آج انسان نے انسانیت کشی، شریعت کشی و نسل کشی کے ایسے پیچیدہ اسباب اور مہلک ہتھیار ایجاد کر لئے ہیں جو ایک ہی لمحہ میں شہروں کے شہر ویران کر دیتے ہیں۔ یہ چیزیں مہلک سے مہلک شکل اختیار کرتی جا رہی ہیں اور انسان کیلئے بہت سنجیدہ خطرہ ہیں لیکن اس سے بڑا خطرہ جو انسانیت کو لاحق ہے وہ انسان کی ذہنی کاوشوں کا خطرہ ہے جو آج کہیں زیادہ مہلک اور خطرناک صورت میں موجود ہے۔

یہ بات ثابت شدہ بھی ہے اور مطالعہ رکھنے والوں کو معلوم بھی ہے کہ انسان کو خود انسان کی ذہنی کاوشوں سے جو نقصان پہنچا ہے شاید اتنا اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی مصنوعات سے بھی نہیں پہنچا۔ یعنی افکار و نظریات کے ہاتھوں ہلاک ہونے والی قومیں، آئے دن اپنی موت مرجانے والی قومیں، ثقافتی و فرہنگی موت مرجانے والی قومیں، ان کے ہلاک شدہ گان کی تعداد کہیں زیادہ ہے بجائے ان کے کہ جنہیں اسلحے، بارود

اور شمشیر کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔اس وقت مہلک ترین نظریات انسانیت کے لئے خطرہ ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان کی ظاہری شکل بہت خوبصورت ہے۔

ظاہر دلکش، باطن سرکش

اسلحہ متعارف کروانے اور تسلیحاتی وعسکری ذہن بنانے کے لئے اسلحہ کو خوبصورت شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔اسلحہ کی (Shape) اتنی خوبصورت ہوتی ہے کہ سب سے زیادہ پسند آتی ہے۔اگر آپ بچے کو کھلونوں کی دکان پر لے جائیں تو جو چیز سب سے زیادہ بچے کو (Attract) کرے گی وہ کسی جنگی اسلحے یا ساز وسامان کی بچکانہ شکل ہوگی۔اس لئے کہ یہی بچہ جو آج کھلونا نما اسلحہ سے کھیلے گا کل اس کو ایک حقیقی اسلحہ سے آشنا ہونا ہے۔

اسی طرح نظریات بھی ہیں۔بعض نظریات کا ظاہر اتنا حسین وخوبصورت ہے کہ جو فرد ذہنی طور پر بچپن میں ہے اس انسان کے سامنے یہ فکر رکھی جائے تو یہ ذہنی بچہ فوراً اس کو چنتا ہے اور اس فکر کو اپنی سرگرمیوں کا محور قرار دیتا ہے۔علامہ اقبالؒ کے بقول:

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو
مہرباں ہوں میں، مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو

پھر پڑا روئے گا اے نو واردِ اقلیم غم
چبھ نہ جائے دیکھنا! باریک ہے نوکِ قلم......[1]

فکری نابالغ کو معلوم نہیں ہے کہ بعض نظریات تباہ کن ہتھیار ہیں۔یہ انسانی تہذیب کو مٹا کے رکھ دیں گے لہٰذا بہت سارے ایسے نظریات گھڑے گئے ہیں جن سے انسانی تہذیب وتمدن کو بگاڑ کے اور منحرف کر کے تباہ کیا جاتا ہے۔وہ بہت سارے ازم ہیں، از جملہ سیکولرازم کہ جو نہایت ہی تباہ کن فلسفہ حیات ہے۔

---

[1]......(بانگ درا،صفحہ ۸۱،" طفل شیر خوار "کے عنوان سے)

سکیولرازم، تہذیبوں کی جنگ کا اسلحہ

اس وقت اسلام جس (Border) پرلڑ رہا ہے اور جہاں مزید لڑنا ہے، وہ تہذیبوں کی یلغار اور جنگ ہے۔ دو عظیم جنگیں ہم نے سنی ہوئی ہیں اور کسی حد تک ان کے بارے میں معلومات بھی ہیں۔ تیسری جنگ عظیم کمیونزم اور امپیریل ازم یا مشرق و مغرب (مشرقی یورپ اور مغربی یورپ) کے درمیان لڑی گئی۔ یہ پوری دنیا میں اور ہر میدان میں لڑی گئی اور اس تیسری جنگ عظیم کو سرد جنگ کا نام دیا جاتا ہے۔

اب چوتھی جنگ عظیم لڑی جارہی ہے اور یہ بھی مشرق و مغرب کے درمیان لڑی جارہی ہے لیکن اب مشرق میں کمیونزم کے خلاف نہیں بلکہ ''اسلام کے خلاف جنگ'' ہے۔ چوتھی جنگِ عظیم ''تہذیبوں کی جنگ'' ہے۔ یہ تہذیبوں کا تصادم ہے۔

ندائے شاعر فردا برائے بیداریٔ مسلمین

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے آج سے تقریباً پینسٹھ سال پہلے اس چوتھی جنگ عظیم کی خبر دی تھی کہ آئندہ لڑائی اسلام اور مغرب میں واقع ہوگی۔ خداوند تعالیٰ نے اقبالؒ کو عظیم بصیرت عطا کی تھی لہٰذا اس بصیرت کی آنکھ سے حوادث کو دیکھ لیتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ میں شاعرِ فردا ہوں، شاعر امروز نہیں ہوں۔

نغمہ ام از زخمہ بی پرواستم
من نوای شاعر فرداستم
عصر من دانندۂ اسرار نیست
یوسف من بھر این بازار نیست......۱

شاعرِ فردا نے مستقبل کی جنگ کو ماضی میں دیکھ لیا اور اپنی قوم کو اس کی خبر دے دی۔ علامہ اقبالؒ نے

۱......(کلیات اقبالؒ۔فارسی،اسرار خودی)

ایک نظم میں اس چوتھی جنگ عظیم کا تذکرہ یوں فرمایا ہے کہ ابلیس نے ایک دفعہ اپنے مشیروں اور نمائندہ کا اجلاس بلایا جس میں دور دراز علاقوں سے ابلیس کے جنی اور انسانی نمائندے شریک ہوئے۔ ہر ایک نمائندہ نے اپنی اپنی گزارش پیش کی اور جو مشکلات ان کو درپیش تھیں ان کا تذکرہ کیا۔ ان سب کی مشترکہ مشکل یہ تھی کہ جن جن مناطق اور اقوام میں ہماری ماموریت ہے ان میں ہمارا مطلوبہ نتیجہ نہیں نکل پا رہا۔

انہوں نے کہا کہ بعض ممالک، بعض قومیں یا بعض افراد دیکھ کر ہمیں بہت پریشانی ہوئی۔ ہم برق رفتاری سے اس دنیا کو فساد کی طرف لے جانا چاہتے ہیں لیکن وہ مطلوبہ رفتار سے اس طرف نہیں جا رہے۔ ہم پھر بھی گوشہ و کنارِ عالم میں کچھ مصلحین اور اعمالِ صالحہ دیکھتے ہیں۔

وہ آپس میں بحث کر رہے تھے کہ ہم دنیا میں بے عدالتی برقرار کرنا چاہتے ہیں لیکن سوشلزم مساوات کا نعرہ لگا رہا ہے، ہم لوگوں کو مادیت کی طرف رغبت دلانا چاہتے ہیں لیکن ہندومت اور بدھ مت لوگوں کو معنویت اور باطن کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ مزدکیت [1] لوگوں کو مساوات کی طرف دعوت دیتی ہے۔ اس طرح انہوں نے ایک ایک کر کے ساری مشکلات پیش کیں۔ انہوں نے اپنے بزرگ سے کہا کہ دیکھو یہ ہمارے لئے بہت بڑے بڑے خطرے ہیں ان کے ہوتے ہوئے ہم کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں؟!

اجلاس کے اختتام پر ابلیس نے بھی اپنے نمائندوں سے خطاب کیا اور اس اجلاس کے نچوڑ کے طور پر یہ نتیجہ نکالا۔ کہا کہ میرے بھائیو! تم جن خطرات اور مشکلات سے خائف و پریشان ہو درحقیقت یہ خطرے نہیں ہیں۔ ان سے پریشان نہ ہونا، ہندو دھرم، بدھ مت اور مزدکیت خطرے نہیں ہیں۔ مجھے جو پریشانی ہے وہ کل کے خطرے سے ہے اور یہ کل کے خطرے نہیں ہیں۔ کل کا خطرہ ''اسلام'' ہے۔ اگر تمہیں کچھ کام کرنا ہے تو اس

---

[1]...... مزدکیت ایک آئین اور مذہب کا نام ہے جس کا مؤسس مزدک ہے۔ یہ مذہب شاہِ ایران قباد ساسانی کے دور میں وجود میں آیا اور بہت سوں کو اپنا ہمنوا بنالیا حتیٰ کہ قباد کو بھی اپنا مرید بنالیا۔ اس کی اساس اشتراکیت اور مساوات ہے لیکن ایرانی بزرگوں نے اس کی مخالفت کی، آخرکار نوشیرواں کے دور سلطنت میں اپنے چند ہزار پیروکاروں سمیت ہلاک ہو گیا۔

کے خلاف اٹھواور سب مل کر منصوبہ بناؤ، اپنے آپ کو اسلام سے نبرد کے لئے آمادہ کرو۔ اگر تمہیں لڑنا ہے تو اسلام سے لڑو ورنہ یہ ایسا خطرہ ہے جو ہم سب کو نیست و نابود کردے گا۔ ابلیس نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب وشرق
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامان سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بناسکتی ہے میری ایک ہو
کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
دست فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے!......[1]

---

[1]......(ارمغانِ حجاز،ابلیس اپنے مشیروں سے،صفحہ۱۷،۱۶)

لہٰذا یہ ثقافتی یلغار کا زمانہ ہے۔ شیطانِ بزرگ اور اس کے کارندوں نے دین اور دیانت کے خاتمہ کے لئے باقاعدہ طریقہ کار سوچا اور راہ حل نکالا ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے تہذیبوں کی جنگ (Cultural war) کا نظریہ دیا۔ اس تفکر کے حامی اور چیلے تو بہت ہیں لیکن اس کے بانی وامام دو برجستہ فرد ہیں اور دونوں کا تعلق امریکہ سے ہے۔ ایک (Fukuyama) اور دوسرا (Huntington) ہے۔ تہذیبوں کی جنگ کے نظریہ کے یہ دو جہنمی امام ہیں اور اب یہ جو کچھ ہو رہا ہے ان دو کے اس نظریہ کے تحت ہو رہا ہے۔

جب امریکی صدر نے اسلام کے خلاف مسلح جنگ کا آغاز کیا جبکہ غیر مسلح جنگ بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اسے اگلے مرحلے میں ڈالنے کیلئے امریکہ کے ساٹھ روشن فکروں نے مل بیٹھ کر ایک بیانیہ جاری کیا۔ انہوں نے اطلاعیہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ جنگ عدالت، حق اور انصاف کی جنگ ہے۔ اس بیانیہ کی عبارت لکھنے والے یہی دو فرد تھے اور پھر انہوں نے یہ بیانیہ پوری دنیا میں نشر بھی کیا۔

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ امریکہ کی شروع کردہ جنگ کسی خاص قوم، فرد یا گروپ کے خلاف نہیں ہے بلکہ ہزاروں دلائل موجود ہیں کہ یہ مسلح جنگ وہی تہذیبوں کی جنگ ہے کہ جس کی خبر علامہ اقبالؒ نے دی تھی۔ اس جنگ کے پیچھے ان کے نظریہ پرداز (Think Tanks) اور (Brain Trusts) موجود ہیں۔ لہٰذا انہوں نے فوراً حمایت کی کہ یہ جنگ ہونی چاہئے بلکہ اسے بہت پہلے ہونا چاہئے تھا۔ اس جنگ میں سب کو ساتھ دینا چاہئے کیونکہ اسلام اتنی بڑی تہذیب ہے کہ اسے آسانی سے نہیں گرایا جا سکتا۔

جو اقدام بش نے کیا وہ اسے اسلام کے خاتمے کے لئے ضروری سمجھتے تھے لیکن اس سے پہلے کہ یہ مسلحانہ جنگ شروع کریں پہلے انہوں نے نظریاتی جنگ شروع کی۔ اس نظریاتی جنگ میں انہوں نے اپنا اہم ترین اسلحہ دین کے خلاف استعمال کیا یعنی سکیولرازم کا ٹینک اور لادینیت کا میزائل استعمال کیا۔ سالہا سال اس کو پال پوس کر بال و پر دے کر، پروان چڑھا کر جب ایک نقطہ پر پہنچا دیا تو ایک ایک کر کے بہت سارے ممالک اس کے سامنے تسخیر ہوئے، تہذیبیں جھکیں اور اب ہماری باری ہے۔

پاکستان، سکیولرازم کی لپیٹ میں

اس وقت ہمارے ملک میں نو وارد اور ناخواندہ مہمان کے طور پر سکیولرازم کا فاسد نظریہ آپہنچا ہے۔ یہ ایک وارداتی نظریہ ہے اور اس مکتب ونظریہ کو اس وقت بھرپور وسائل کے ساتھ ہماری سرزمین اور معاشرے میں عملی کرنے کی تدبیریں وکوششیں ہورہی ہیں لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم اس نظریہ کو اچھی طرح پہچان لیں۔ ہمیں کم از کم یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جس وادی میں ہمیں دھکیلا جارہا ہے وہ ہے کیا؟ ہمارے جوانوں کو کم از کم یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہم کس سمت وسو میں جارہے ہیں۔ ہم سمت وسو کا پہلے سے تعین کریں جو ایک بیدار قوم کی علامت ہے۔ اہلِ غفلت وہ لوگ ہیں جنہیں کسی مخمصہ میں ڈال دیا جائے، کسی طوفان میں دھکیل دیا جائے اور بعد میں ان کو خبر ہو کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا تھا! دنیا میں مختلف خطوں اور ممالک میں کامیاب یا ناکام تجربہ کے بعد اس وقت ہماری سرزمین کو سکیولرازم کے لئے منتخب کیا گیا ہے جو آمادہ ترین سرزمین ہے۔

ہماری تہذیب وثقافت کی سرزمین، ہماری نظریاتی واعتقاداتی سرزمین، ہماری ذہنی وقلبی سرزمین، ہماری سیاسی، اجتماعی ومعیشتی سرزمین اس وقت آمادہ اور تیار کی گئی ہے تاکہ اس کھیت میں سکیولرازم کا بیج بویا جائے اور ایک نئی فصل اگائی جائے تاکہ آئندہ ہم اس کے ذریعہ اپنی زندگی بسر کریں۔

جو لوگ اس عزم کا پرچار کرکے اسے نافذ کرنا چاہتے ہیں ہم ان کی لفاظیوں اور بظاہر خوبصورت باتوں میں نہ آئیں؟ کیا اخبارات اور روزناموں کی شہ سرخیوں کے پڑھنے سے سکیولرازم کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے؟ کیا ہم چند منٹ کے ریڈیو نیوز بلٹن کو ان حقائق کے لئے کافی سمجھیں؟ حق یہ ہے کہ ان مسائل کو سمجھنے کے لئے زیادہ عمیق تر فکر اور اندیشہ کی ضرورت ہے۔

سکیولرازم جیسے موضوعات چھیڑنے اور سمجھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ اہتمام کی ضرورت ہے خصوصاً جب اس کا رخ نہ صرف علاقائی اور ملکی تہذیب کی طرف ہو بلکہ سب سے بڑھ کر اسلام کی طرف ہو۔ غرور وتکبر میں مبتلا اس فاتح ازم نے یکے بعد دیگرے کئی ادیان وتہذیبیں فتح کرکے آج اسلام کی طرف رخ کیا ہے۔ جس طرح سکندر، چنگیز اور ہلاکو خان بہت ساری سرزمینیں فتح کر لینے کے بعد غرورِ فتح میں مبتلا ہو کر نئی

سرزمینوں کا رخ کرتے اور ہر سرزمین کو تہہ وبالا کرتے تھے اسی طرح آج یہ نظریہ بھی اسلامی تہذیب کو فتح کرنے کے لئے میدان میں اترا ہے۔

ترکی جو عثمانی دور خلافت میں اسلامی حکومت کا پایہ تخت اور ایک زمانے میں اسلام کا سب سے بڑا علمی مرکز رہا ہے۔اس ملک نے تقریباً پوری دنیا پر اسلام کے نام پر حکومت کی ہے لیکن آج اسی ترکی میں اسلام، دیانت اور اسلامی تہذیب کے سوا ہر چیز پائی جاتی ہے۔ترکیہ سے اسلام کی جڑیں نکال کر باہر پھینک دی گئیں اور یہ کام کسی مسلح فوج اور جارحانہ حملے، اسلحہ کے زور اور بندوق کی نال پر نہیں ہوا اور نہ ہوسکتا تھا بلکہ انہوں نے دیانت کے خاتمہ کے لئے جو حربہ استعمال کیا وہ یہ تھا کہ پہلے خود دین داروں کے اندر دیانت کو اتنی منفور چیز بنایا گیا کہ خود انہوں نے مطالبہ کیا کہ خدارا! ہمیں دین سے نجات دو، مذہب سے ہماری جان چھڑاؤ۔

اب یہ حربہ ہمارے ملک میں آزمایا جارہا ہے۔دین کے نام پر دہشت گردیوں سے لوگ تنگ آچکے ہیں۔مذہب کے نام پر ہر روز ثواب کیلئے بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام، مذہبی شدت پسندی، مساجد اور امام بارگاہوں پر حملوں سے آہستہ آہستہ سکیولرازم کے لئے میدان ہموار ہورہا ہے۔یہ مذہبی دہشت گردی درحقیقت اس لئے کروائی جارہی ہے تاکہ لوگ دین سے تنگ آکر خود مطالبہ کریں کہ ہمیں دین سے نجات دو۔جب لوگ دین سے تنگ آجائیں تو اس کی جگہ سکیولرازم خود بخود آجائے گا۔

متعهدانہ طرزِ گفتگو

یہاں یہ توقع ہرگز نہ ہو کہ ہم سکیولرازم کے متعلق معلوماتی گفتگو کریں گے۔جس طرح مدرسوں اور دانشگاہوں (یونیورسٹیز) کے اندر کسی موضوع کے بارے میں نصابی اور کتابی بحث کی جاتی ہے۔علمی مراکز میں بحث فقط علمی غرض کیلئے ہوتی ہے۔الفاظ کی بحث، مفاہیم ومعانی کے اندر دقت، تاریخ علم، مختلف اقوال، اعتراضات، جوابات اور تنقیدات وغیرہ کسی علمی بحث کے اصلی ارکان ہیں۔اس بحث کے اندر تعہد، تحریک، بیداری، ہوشیاری وغیرہ کا شائبہ نہیں ہوتا، عالمانہ اور محققانہ بحث میں مذکورہ مسائل بیان کرلینے کے بعد عالم یا

محقق اپنی کوئی ذمہ داری نہیں سمجھتا۔یہی وجہ ہے کہ محض علمی مراکز میں گفتگو کرنے اور سننے والے سب کچھ جاننے کے باوجود عملی میدان سے دور ہی نظر آتے ہیں۔ ایسی گفتگو سے احساسِ علمیت ضرور پیدا ہوتا ہے، انسان ڈائیلاگز میں تبادلہ افکار کے قابل ہو جاتا ہے،تقریریں کرسکتا ہے، کتابیں لکھ سکتا ہے،سب سے بڑھ کر روشن فکر، عالم، فاضل و محقق کہلا سکتا ہے اور ملازمت بھی حاصل کرسکتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں ایک پیغمبرانہ ومتعہدانہ طریقۂ گفتگو ہے کہ علمیت نہیں بکھیری جاتی، فلسفہ بافی نہیں کی جاتی، کثرت سے حوالے نہیں ہوتے، ہمہ دانی کا تاثر نہیں بٹھایا جاتا اور علمی لوریاں نہیں سنائی جاتیں بلکہ اس طرز تخاطب میں ایثار اور تعہد کا احساس دلایا جاتا ہے، لوگوں کو آگاہی دی جاتی ہے، خواب سے بیدار کیا جاتا ہے، غفلت سے نکالنے کے لئے جھنجھوڑا جاتا ہے، احساسِ زیاں دلایا جاتا ہے، بیدار کر کے حرکت میں لایا جاتا ہے، قوموں کو مستقبل کے لئے پرامید بنایا جاتا ہے، آئندہ و حالیہ خطرات سے روشناس کر کے مشکلات کی نشاندہی کی جاتی ہے اور مسائل ومشکلات کا راہِ حل بتایا جاتا ہے۔

مذکورہ صفات کی پیغمبرانہ گفتگو کا نمونہ اگر کوئی دیکھنا چاہے تو اسے حضرت امام خمینیؒ کے خطبات و پیغامات ملاحظہ کرنے چاہئیں، جمال الدین افغانی کے احساسات دیکھنے چاہئیں اور خاص کر سرزمین پاک وہند میں بیداری کی فریادیں، دردمند کے نالے اور تحریک وحرکت ایجاد والے غزل سرا علامہ اقبالؒ کا کلام دیکھنا چاہئے۔محض علمی وتاریخی بحث کے لئے سکیولرازم کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے۔علمی تشخص اور وقت گزاری کیلئے کوئی بھی موضوع چھیڑا جاسکتا ہے مثلاً کمیونزم سے سوشل ازم اور سوشل ازم سے کیپٹل ازم وغیرہ لیکن متعہدانہ گفتگو اور اندازِ بیان کی غرض سے بحث کے لئے سکیولرازم کو دیگر موضوعات پر ترجیح حاصل ہے۔

فصل دوم

سکیولرازم؛ دین‌کشی کام‌هلک تفکر

سکیولرازم کی تعریف

سکیولرازم، لاطینی (Latin) لفظ Saeculum سے ماخوذ ہے۔ سکیولر کا لغوی معنیٰ ''نامقدس'' (Unholy) ہے جو مقدس (Holy) کے مقابلے میں ہے۔ سکیولرازم، توہین (Blasphemy) اور بے حرمتی (Profanation) کے معانی پر مشتمل ہے۔

اصطلاحاتِ علمی سے کنارہ کر کے اگر ہم سکیولرازم کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں: ''سکیولرازم ایک ایسا نظریہ ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ دین کو زندگی کے تمام پہلوؤں اور تمام شعبوں سے نکال کر اسے زندگی کا ایک الگ اور مستقل شعبہ بنایا جائے، وہ بھی اس طرح سے کہ خود اس دینی شعبہ کا زندگی کے باقی شعبوں سے کوئی تعلق نہ ہو اور نہ ہی ان باقی شعبوں کا شعبۂ دین سے کوئی تعلق ہو''۔

انسانی زندگی کے مختلف پہلو اور شعبے ہیں مثلاً ہر انسان کی زندگی کا انفرادی و ذاتی شعبہ ہے، خاندانی و عائلی شعبہ ہے، دوسرے انسانوں کے ساتھ ارتباط کا شعبہ ہے، تعلیم اور آموزش کا شعبہ ہے، تربیت کا شعبہ ہے اسی طرح سیاست، معیشت، اقتصاد، اقوام کے مابین ارتباطات اور دیگر بیسیوں شعبے ہیں۔ پس زندگی کے تمام شعبوں سے دین کو خارج کرنا اور پھر اس کو زندگی کا مستقل شعبہ بنانا سکیولرازم کہلاتا ہے۔

چونکہ ہماری بحث ''اسلام اور سکیولرازم'' کے عنوان سے ہے لہٰذا کہیں گے کہ اسلام کو ان تمام شعبوں سے باہر نکالنا اور پھر اسے مستقل شعبۂ زندگی بنانا تاکہ دوسرے شعبے اس سے متاثر نہ ہوں ورنہ سکیولرازم کا ہدف فقط اسلام نہیں بلکہ اس کا اصل ہدف دین ہے کہ جو بھی دین ہو۔

سکیولرازم کی تعریف

انسانی زندگی میں دین کا عمل دخل

انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دین کا بڑا عمل دخل ہے۔ دینی اعتقادات، اخلاقیات اور احکام کی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بڑی تاثیر ہے حتیٰ کہ ہماری سوچ اور فکر میں بھی دین مؤثر ہے۔ انسان کی انفرادی زندگی کو منظّم کرنے کے لئے دین کا بہت عمل دخل ہے مثلاً انسان نماز پڑھتا ہے، جھوٹ نہیں بولتا، امانت داری سے کام لیتا ہے، اپنا لباس پاک رکھتا ہے یا ہمیشہ باوضو رہتا ہے تو یہ اس کی انفرادی زندگی میں دین کی مداخلت اور تاثیر ہے اسی طرح اعتقادی، خلقیات اور صفات و ملکات کے میادین ہیں۔ یہ سارے میدان اگرچہ انفرادی ہی ہیں لیکن ان میں دین کا بڑا عمل و دخل ہے۔

انسان کی عائلی زندگی کے شعبہ میں دین بے حد تاثیر رکھتا ہے۔ جب مرد و عورت اپنی باہمی اور مشترکہ عائلی زندگی تشکیل دیتے ہیں تو یہاں پر دین کی مداخلت کے بغیر ممکن نہیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ کس سے رشتہ ازدواج برقرار کرنا ہے؟ یہاں ایک دینی حد ہے کہ محرم سے رشتہ برقرار کرنا حرام اور ممنوع ہے۔ شریک حیات چننے کیلئے دین نے مداخلت کر کے ایک گروہ کو خارج کر دیا اور کہا کہ یہ محرم ہیں، ان کا بڑا احترام ہے، ان سے رشتہ ازدواج برقرار نہیں کر سکتے۔ عائلی زندگی میں پہلے قدم پر ہی دین نے مداخلت کی۔ پھر جب رشتہ ازدواج برقرار ہو جائے اور عائلی زندگی تشکیل پائے تو ان دو کے آپس میں روابط، حقوق اور ذمہ داریاں تعین کرنے کیلئے دین نے مداخلت کی ہے۔ اسی طرح اولاد اور والدین کے آپس میں رشتے اور ایک دوسرے پر حقوق و فرائض معین کرنے کیلئے دین نے مداخلت کی ہے۔ فرزند کی پیدائش سے پہلے اور پیدائش کے بعد جو رویہ اور سلوک اس کے ساتھ روا رکھا جا سکتا ہے وہ دین نے بتا دیا ہے۔ آیا پیدائش سے پہلے اپنے فرزند کی ہلاکت کا اختیار والدین کو ہے؟ پیدائش کے بعد والدین کی فرزند کے حوالہ سے کیا کیا ذمہ داریاں ہیں؟ ان سب امور میں دین کی مداخلت ہے۔ اس عائلی شعبہ میں دین کا عمل دخل کتنا زیادہ ہے۔

دینِ مقدس اسلام کی انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اتنی زیادہ مداخلت ہے کہ کسی اور دین کی اتنی نہیں ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں دین اسلام کی مداخلت نہ ہو جیسے انسان کا سب سے زیادہ

پرائیویسی عمل مثلاً بیت الخلاء جانا' اس میں بھی دین اسلام کی مداخلت ہے۔

دنیا میں کون سا ازم ہے جو یہاں تک مداخلت کرے؟ کیا سکیولرازم، سوشلزم، کمیونزم، جمہوریت یا کسی اور سیاسی مکتب میں کہا گیا ہے کہ انسان جب بیت الخلاء میں ہو تو پھر کیا کرے؟ کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ جو انسان کسی بھی دین یا ازم کا پابند نہ ہو وہ وہاں اپنی مشکل حل کر لیتا ہے لیکن دین اسلام نے یہاں بھی آ کر مداخلت کی ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ بیت الخلاء میں قبلہ رخ بیٹھنا حرام ہے اور اسی طرح بعض دوسرے مستحبات بھی ہیں لہٰذا اسلام نے پرائیوٹ ترین شعبہ زندگی کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ اگر ان تمام شعبوں سے دین کو بے دخل کریں گے تو دیکھنا پیچھے کیا فاجعہ ہوگا؟

سکیولرازم بہت بڑا فاجعہ

سکیولرازم یعنی دین کو تمام شعبہ ہای زندگی سے باہر نکالنا۔ اس مفہوم کو اگر ایک فزیکل مثال کے ساتھ بیان کریں تو زیادہ واضح ہو جائے گا۔ وہ یہ کہ انسانی بدن کے تمام اعضاء و جوارح سے خون کو نچوڑیں اور پھر بدن کے ساتھ باہر یا اندر ایک الگ تھیلی میں ڈال دیں اور خون سے کہیں کہ اب تم نے ان اعضاء و جوارح کے اندر کوئی مداخلت نہیں کرنی ہے۔ بدن کے دیگر اعضاء کے ساتھ آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ اپنا کام کرو وہ اپنا کام کریں۔ یہی سکیولرازم ہے۔

شاید ہم جذبات میں کہہ بھی دیں گے کہ یہ تو بہت اچھی بات ہے چونکہ ہم جہاں سوئی لگاتے ہیں وہاں سے خون نکل آتا ہے۔ دینی اور مذہبی لوگ کہیں گے کہ یہ تو نجس بھی ہے۔ اس سے بار بار انگلی بھی نجس ہوتی ہے لہٰذا اچھا ہے کہ خون بدن میں نہ ہو، زخمی ہونے کی صورت میں کم از کم ہاتھ تو نجس نہیں ہوں گے یا جن کو بلڈ کینسر ہو جاتا ہے وہ خوش ہو جائیں کہ یہ تو اچھا ہوگا کہ جب خون ہی نہیں ہوگا تو بلڈ کینسر بھی نہیں ہوگا، اسی طرح خون کے ذریعے پھیلنے والی جو بیماریاں ہیں، وہ بھی نہیں پھیلیں گی لہٰذا خون کو بدن سے نکال کر ایک تھیلی میں جمع کرنے کے بہت سارے فائدے ہیں۔ تمام بدن آسودہ ہوگا اور اعضاء و جوارح جشن منائیں گے کہ

ہماری آزادی کے دن آنے والے ہیں! حالانکہ یہ احساس ہونا چاہئے کہ خون کا بدن کے ساتھ کیسا تعلق ہے؟ اور خون کی کہاں تک مداخلت ہے؟ اگر خون کا اعضاء بدن کے ساتھ تعلق ختم کیا جائے تو پھر دیکھیں پیچھے کیا سانحہ رونما ہوگا؟ کیا فاجعہ عظیم برپا ہوگا؟

انسانی زندگی کے تمام شعبے بدن کی حیثیت رکھتے ہیں اور دین اس میں جاری خون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب اگر دین کو انسانی زندگی سے نکال دیا جائے اور دین کو ایک مستقل شعبۂ زندگی بنایا جائے پھر انسان کو یہ کہا جائے کہ تم اپنی زندگی میں آزاد ہو، شادی کرو یا نہ کرو، عائلی زندگی اور خاندان تشکیل دو یا نہ دو چونکہ تم آزاد ہو پس اسی طرح دین بھی زندگی کا ایک شعبہ ہے لہٰذا تم دین میں آؤ یا نہ آؤ۔ باقی تمام شعبے دین سے آزاد ہیں لہٰذا اب جو تمہاری مرضی ہے کرو کیونکہ دین تمہارا راستہ نہیں روکے گا اور تمہیں بہت ساری آزادیاں حاصل ہوں گی جیسے ایک مملکت میں مختلف ادارے ہوتے ہیں اور ہر ادارے کے اپنے اپنے وظائف اور ذمہ داریاں ہیں۔ کسی ادارے کو حق نہیں ہے کہ دوسرے ادارے میں مداخلت کرے۔ اس لحاظ سے دین بھی انسانی زندگی کا ایک ادارہ ہے اور یہ ادارہ دوسرے تمام اداروں سے لاتعلق ہے۔ اسے کسی قسم کی مداخلت کرنے کا حق نہیں ہے لیکن دیکھیں اس کے پیچھے کیا سانحۂ عظیم رونما ہوگا۔

سکیولرازم انسانیت کے لئے فاجعہ عظیم ہے۔ بدن سے خون سمیٹ لینے سے جو فاجعہ برپا ہوتا ہے اس سے بہت بڑا فاجعہ دین کو انسانی زندگی سے نکالنے سے برپا ہو جائے گا!

عملی سکیولرازم اور قانونی سکیولرازم میں فرق

عملی سکیولرازم اور قانونی سکیولرازم میں فرق ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سکیولرازم الحاد اور دہریت تو نہیں، ہم بھی کہتے ہیں کہ الحاد نہیں ہے لیکن الحاد سے بدتر ہے۔ اگر دیکھا جائے تو عملی طور پر ہم سب سکیولر ہیں! مسلمان ممالک، مسلمان اقوام، مسلمان قبیلے یعنی ہم سب چھوٹے بڑے، زن و مرد حتیٰ متدینین سب کے سب عملی طور پر سکیولر ہیں۔

شاید آپ کہیں گے کہ جب عملی طور پر ہم ویسے بھی سکیولر ہیں تو پھر خطرہ کیا ہے؟ سکیولرازم کے نام سے گھبراتے کیوں ہیں؟ مثلاً ہم شیعہ ہیں اور ہم پر جو نظام نافذ کیا گیا ہو وہ بھی شیعہ نظام ہو تو اس میں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟ یا مثلاً ہم سب ڈیموکریٹ ہوں اور جو نظام ہم پر نافذ کیا جائے وہ بھی ڈیموکریسی ہو تو کیا یہ گھبرانے کی بات ہے؟ اسی طرح اگر ہم سب عملاً سکیولر ہیں تو پھر کوئی نیا کام نہیں ہو رہا ہے۔ یہ تو پہلے سے انجام شدہ کام ہے۔

ہم عملاً اس طرح سکیولر ہیں کہ عملی طور پر مذہب اور دین ہماری زندگی کا ایک شعبہ ہے اور زندگی کے باقی شعبے ہمارے مذہب و دین سے بالکل جدا ہیں۔ دین کی کم سے کم مداخلت بھی نہیں ہے البتہ درجات اور مراتب محفوظ ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ جن کی زندگی کے دوسرے شعبوں میں ذرہ برابر دین کی دخل اندازی نہیں ہے۔ بعض ایسے ہیں جن میں تھوڑی بہت ظاہری یا ابتدائی حد تک کچھ نہ کچھ دین کی مداخلت ہے۔

آپ ایک ایسا انسان ڈھونڈیں کہ جس کی پوری زندگی کے تمام شعبے دین سے متاثر ہوں اور ان میں دین کی مداخلت ہو۔ ایسے انسان اس روئے زمین پر بہت کم ملیں گے۔ سب کی زندگی میں دین ایک شعبہ ہے مثلاً وہ لوگ جو سارے کاروبارِ زندگی بھی کرتے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں۔ سکیولر وہ نہیں جو نماز نہیں پڑھتا بلکہ وہ تو کچھ بھی نہیں ہے، اس کے لئے آپ کوئی اور ازم کا نام دے سکتے ہیں۔ سکیولرازم یہی ہے کہ آپ زندگی میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر نماز بھی پڑھیں، تھوڑا دینی رسومات میں بھی حصہ لے لیں، محرم کے ایام میں کچھ رسوماتِ دینی بھی انجام دیں۔ یہی طبقہ سکیولر ہے۔

سکیولرازم تو اس سے نہیں روکتا کہ آپ نماز نہ پڑھیں یا دینی رسومات میں شرکت نہ کریں۔ جب اس نے خود کہہ دیا ہے کہ دین بھی ایک شعبۂ زندگی ہے تو یہ انسان کو دینی رسومات سے کبھی نہیں روکے گا جیسا کہ آپ کے گھر میں ہر کمرے میں بہت ساری مختلف تصویریں آویزاں ہیں۔ فرض کریں آپ ان ساری تصویروں کو کمروں سے اتار کر اکٹھا کر کے ایک خاص کمرے میں آویزاں کر دیتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ کمرہ فقط تصویروں کے لئے ہے، یہ تصویر خانہ ہے۔ تصویریں پہلے بھی آپ کے گھر میں تھیں لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے

سارے گھر میں تھیں اب گھر کے ایک خاص کمرے میں ہیں لہٰذا اگر آپ نے تصویریں دیکھنی ہیں تو کوئی روکتا نہیں بلکہ آپ آزادی سے جاسکتے ہیں اور تصویریں دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح دین زندگی کا ایک شعبہ بن جائے تو جب فرصت مل جائے جا کر دینی مراسم بھی انجام دیں لیکن باقی شعبوں میں اسے نہ آنے دیں۔ عملی طور پر تو ہم سب ایسے ہیں اور یہ عملی سکیولرازم ہے۔ اس کے بھی مختلف درجات اور مراتب ہیں۔ بعض زیادہ درجہ کے سکیولر ہیں جبکہ بعض کم درجہ کے۔

عملی سیکولرازم اور قانونی سیکولرازم میں فرق

قانونی سکیولرازم یہ ہے کہ آپ نے عملی طور پر اپنی سستی یا خواہشاتِ نفسانی کی وجہ سے دین کو زندگی کے شعبوں سے فارغ کر دیا ہے تو آپ کی یہی حرکت نظام و قانون بن جائے، اس لادینیت کو قانونی شکل دی جائے۔ جب سکیولرازم قانون بن جائے اور سکیولر اسٹیٹ، سکیولر انسان و سکیولر آئین سامنے آجائیں پھر اس صورت میں دینی احکام پر عمل کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

لہٰذا عملی سکیولرازم اور قانونی سکیولرازم میں فرق یہ ہے کہ عملاً دین جس کی زندگی سے باہر ہے لیکن اگر آنا چاہیں تو راستہ کھلا ہے اور ان کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہے مثلاً ایک بے حجاب خاتون جو دینی مراسم بھی انجام دیتی ہے جس دن پشیمان ہو جائے اور حجاب کرنا چاہے تو کرسکتی ہے، اگر ایک دن چاہے کہ اپنے بدن کو ڈھانپ لے تو نہ صرف اسے کوئی روکتا نہیں ہے بلکہ شاید اس کی حوصلہ افزائی کی جائے لیکن اگر سکیولرازم ایک قانون بن جاتا ہے تو اس کے بعد بے حجاب خاتون قانوناً حجاب نہیں کرسکتی۔ اگر پشیمان بھی ہو جائے پھر بھی نہیں کرسکتی۔

مثالِ دیگر یہ ہے کہ ایک گراؤنڈ، جہاں کوئی آبادی اور روڈ وغیرہ نہ بنا ہو اگر یہاں کوئی گاڑی چلانا چاہے تو اپنی مرضی سے چلا سکتا ہے، جس اسپیڈ سے چلانا چاہے، جہاں بریک لگانا چاہے، جہاں سے موڑنا چاہے، جس طرح سے دل چاہے اسی طرح چلا سکتا ہے لیکن اگر اسی گراؤنڈ پر گھر بنائے جائیں، یہ گراؤنڈ شہر کے دوسرے محلوں سے متصل ہو جائے، یہاں روڈ بھی بنے اور ٹریفک قوانین بھی نافذ کئے جائیں تو اب اسی علاقے میں گاڑی چلاتے ہوئے اپنی مرضی سے نہیں چلا سکتے بلکہ ٹریفک قوانین کی رعایت

کرنی پڑے گی لہٰذا اسکیولرازم کے آنے سے پہلے لوگ آزاد ہیں کہ دین میں آئیں یا نہ آئیں، دین پر عمل کریں یا نہ کریں لیکن اب جبکہ سکیولرازم آ گیا اور اس نے قانونی حیثیت اختیار کر لی تو یہ اجازت نہیں ہوگی کہ پہلے جولا دینی تھی اسے چھوڑ سکیں۔

سکیولر (Secular) اور لائیک (Laic) ریاستوں میں ایسا ہی ہے کہ اگر وہاں کوئی ننگا ہونا چاہے تو ٹھیک ہے ہو جائے، اگر ایک مرد بالکل عریاں ہو کر گلی میں آنا چاہے تو ٹھیک ہے آ جائے، اگر ایک عورت یہ کام کرنا چاہے تو ٹھیک ہے اجازت ہے لیکن اگر ایک عورت دوپٹا اوڑھنا چاہے تو نہیں اوڑھ سکتی کیونکہ یہ جرم ہے۔ جرم کیوں ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ عریانیت دینی آداب یا رسومات میں سے نہیں ہے اس لئے جو عریاں ہونا چاہے ہو سکتا ہے لیکن حجاب کرنا دین کے آداب میں سے ہے، ایک دینی شق ہے، اگر اسکول جاتے ہوئے کوئی حجاب کرے تو یہ دوسرے شعبوں میں دین کی مداخلت ہے اور سکیولرازم میں دوسروں شعبوں کے اندر دین کی مداخلت ممنوع ہے۔ بے شک اپنے گھر یا مسجد میں حجاب کریں اور نماز پڑھنے کے لئے دوپٹا اوڑھیں لیکن چادر و حجاب کے ساتھ اسکول، کالج، یونیورسٹی، مارکیٹ، پارلیمنٹ، کسی ادارے یا گھر سے باہر آنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا جرم ہے۔ اس نظام کے تحت بے حجابی یونیفارم کی حیثیت رکھتی ہے اور یونیفارم کی مخالفت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

وہی چیز جس کو ہم غیر شعوری طور پر اپنی زندگی میں اپنایا تھا اب اس کو قانون بنانے کا وقت آ گیا ہے۔ صرف ایک ریفرنڈم کی ضرورت ہے۔ انڈیا میں فسادخانے مدتوں سے چل رہے تھے کہ جہاں طوائفیں تھیں لہٰذا انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ ایسا کیا جائے جائے کہ وہاں جو کام لوگ ہمارے کہے بغیر اپنی ضرورت کی وجہ سے کر رہے ہیں اسے ہم قانون بنا دیں۔ WTO (World Trade Organization) نے انہیں مشورہ دیا کہ ہندوستان کی معیشت کی بہتری کا بہترین حل یہ ہے کہ طوائفوں کو لائسنس جاری کر دیئے جائیں اور ان پر ٹیکس لگائے جائیں۔ انہوں نے ایک اسٹیمیٹ (Estimate) بھی دیا کہ اتنے کروڑ طوائف جب ایک ملک میں ہوں گی اور وہ سالانہ اتنا ٹیکس دیں گی تو گورنمنٹ کو کتنی آمدنی ہوگی لہٰذا اب یہ اسے قانونی حیثیت دینا

چاہتے ہیں۔ہم نے عملاً اپنی زندگی سے دین نکال دیا ہےاور اب بات یہاں تک آ پہنچی ہے کہ دین نکالنے کو قانون بنا دیا جائے۔

سکیولرازم، ویران گرِ دین

ہر مسلمان، ہر درد رکھنے والے اور ہر دیندار کے لئے لازم ہے کہ وہ دین کی حفاظت اور دفاع کرے خصوصاً دین کی عقیدتی اور نظریاتی سرحدوں کا دفاع سب سے اہم وظیفہ ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ دینداروں کا بھی دفاع کرنا چاہیئے کیونکہ اس وقت دیندار بھی خطرے میں ہیں لیکن دیندار اس وقت قیمتی ہوتا ہے جب اس کے پاس دین ہو اور اس کا دین محفوظ ہو، پھر دیندار بھی محفوظ رہنا چاہیئے لیکن اگر انسان دینداروں کو بچالے اور ان بچے کھچے دینداروں کے پاس دین نامی کوئی چیز نہ ہو تو کیا فائدہ ہے؟ جب محور اور اساس ہی نہ رہے تو دیندار بھی نہیں رہے گا۔انسان کی قیمت ہی دین کی وجہ سے ہے بلکہ ہر چیز جو ہماری زندگی میں کوئی مقام، منزلت اور قیمت رکھتی ہے دین کی وجہ سے ہے مثلاً ہم مسجدوں اور امام بارگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں تو مسجد کو تقدس کس نے دیا ہے؟

اینٹوں کے بنے ہوئے گھر کو یہ تقدس دین نے دیا ہے حتیٰ کعبہ پتھروں کا بنا ہوا گھر ہے اور اگر دین سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوتا تو اس کا کوئی تقدس نہ ہوتا چونکہ دین مقدس ہے لہٰذا جو چیز بھی اس سے متعلق ہو جائے وہ مقدس ہو جاتی ہے۔ اگر ہم اپنی عبادت گاہوں اور مساجد کو بچائیں، دینداروں کو تحفظ دیں، علماءِ دین کو بھی بچائیں لیکن خود دین محفوظ نہ ہو تو اس صورت میں کچھ بھی نہیں بچے گا۔ دین کے بغیر عبادت گاہیں، دین کے بغیر مسجدیں، دین کے بغیر عالم دین، دین کے بغیر مسلمان، آپ تصور کریں کیا منظر ہوگا؟ لہٰذا سب سے پہلی چیز جس کا تحفظ ضروری ہے وہ اصل دین ہے۔

کربلا اسی چیز کا نام ہے۔ کربلا میں امامِ دین، دین پہ قربان ہوگئے۔ ہمارے ائمہ علیہم السلام کی زندگی میں یہی حالت تھی کہ امام تھے لیکن امت اور دینی نظام نہیں تھا۔ جس دور یا جس خطہ میں امام ہو لیکن دین اور دینی

نظام نہ ہوتو ہووہ امام یا جیل وزندان میں ہے یا مقتل میں یا اس کو زہر دے دیا گیا یا گھر میں گوشہ نشین کر دیا گیا۔وہ ظلم وستم کا نشانہ بنتا رہا۔کیوں؟ کیونکہ امت نہیں ہے، دینی نظام حاکم نہیں، دینی اقدار حاکم نہیں ہیں۔

حضرتِ امام خمینیؒ نے اولِ انقلاب میں فرمایا تھا کہ نظام کی بقاء، انقلاب کی حفاظت اوراسلام کا دفاع ہر چیز سے زیادہ واجب ہے، حتیٰ نماز سے بھی زیادہ واجب ہے۔اس وقت بہت ساروں کو یہ جملہ ہضم نہیں ہوا۔آج بھی نہیں ہورہا ہے کہ اس کو کیسے نگلیں، نیچے جاتا نہیں کہ نماز سے زیادہ حفظِ دین اور حفظِ نظامِ دین واجب ہے لیکن اگر انسان غور کرے تو بات صاف اور روشن ہے، اس لئے کہ دین کے بغیر نماز بچائیں تو فائدہ کیا ہے؟ نماز تو دین کی وجہ سے ہے، دین ہوگا تو نماز ہوگی۔یہ کربلا کا کھلا پیغام ہے کہ ہر چیز سے پہلے دین کو تحفظ دو۔اگر دین محفوظ ہوگیا تو تمہیں بھی تحفظ مل جائے گا۔

آپ ایسے ممالک کی مثال سامنے رکھیں جہاں دین محفوظ نہیں رہا مثلاً روس میں دینی مراکز قائم تھے، اورعلماءِ دین بھی تھے لیکن دین ممنوع ہوگیا۔جب دین ممنوع ہوگیا تو اب وہ دینی مراکز کس کام کے ہیں؟ مساجد کو اصطبل بنادیا گیا۔ یہ مراکز ستر سال تک قائم رہے۔ انہوں نے گرائے نہیں بلکہ انہیں فوجی بیرکوں، ہسپتالوں اوراسکولوں میں تبدیل کیا گیا۔اس طرح یہ دینی مراکز رفاہی کاموں کے لئے کام آ گئے لہٰذا ہر مسلمان کے لئے سب سے اہم ترین وظیفہ اورفریضہ یہ ہے کہ وہ پہلے اپنے دین کو بچائے۔

تقیہ انسان کے لئے اس وقت جائز ہے جب دین محفوظ ہو لیکن جب دین محفوظ نہ ہو اس وقت تقیہ اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔یہی فلسفۂ کربلا بھی ہے۔کربلا جان بچانے کا فلسفہ نہیں بلکہ دین بچانے کا فلسفہ ہے۔ کربلا میں اگر امام حسین علیہ السلام اوراصحابِ حسینؑ جان بچانا چاہتے تو بچا سکتے تھے جس طرح دوسروں نے اپنی جان بچائی لیکن ان کا مقصد دین بچانا تھا۔سکیولرازم جس کی زد میں اس وقت ہم آ چکے ہیں معلوم نہیں آئندہ کیا ہوگا؟

یہ دین پر ایک ایسی یلغار ہے جس میں دیندار محفوظ رہیں گے۔ان کو کوئی نہیں چھیڑے گا لیکن دین ان کے اندر سے اٹھالیا جائے گا۔برعکس دوسری جگہوں کے کہ ان میں دین کو نہیں چھیڑا جاتا تھا بلکہ دینداروں کو مارا جاتا تھا۔وہ اتنی اہم چیز نہیں تھی۔تاریخ میں بہت دفعہ ایسا ہوا ہے۔جنگِ بدر واُحد میں دین محفوظ تھا

دیندار غیر محفوظ تھے تقریباً تمام جنگیں ایسی تھیں۔مشکل وہاں پر ہے جہاں انسان کا دین خطرے میں پڑ جائے جیسے کربلا میں دینداروں کی بہت بڑی اکثریت بلکہ امام حسین علیہ السلام اور آپؑ کے چند اصحاب کے علاوہ پوری امت محفوظ تھی لیکن دین خطرے میں تھا۔سکیولرازم بھی وہ حربہ ہے جہاں دیندار محفوظ ہوتے ہیں لیکن دین خطرے میں پڑ جاتا ہے لہٰذا سکیولرازم دین کشی کا نام ہے۔

دین کبھی کتابوں میں ہے، کبھی مدرسوں، منبروں اور درس و بحث میں لیکن یہ دین محفوظ نہیں ہے۔اگر ہم مدرسوں میں بیٹھ کر چند کتابیں پڑھیں یا چند مدرسے قائم ہیں اور چند مسجدوں میں نماز ہو رہی ہے تو یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ دین محفوظ ہے۔یہ کام تو سید الشہداء علیہ السلام کے زمانے میں بھی ہو رہا تھا۔ بصرہ، کوفہ اور مدینہ میں مدرسے اور شیخ الحدیث موجود تھے، دین کی تعلیم دی جا رہی تھی، مساجد موجود تھیں اور نمازِ جماعت ہو رہی تھی، کربلا میں دونوں گروہ نماز پڑھتے تھے لیکن اس کے باوجود سید الشہداء علیہ السلام نے فرمایا:

وَعَلَى الْاِسْلَامِ اَلسَّلَامُ اِذْ قَدْ بُلِيَتِ الْاُمَّةُ بِرَاعٍ مِثْلِ يَزِيْدَ......[1]

اسلام پر فاتحہ پڑھ دینی چاہیے جب امت یزید جیسے فرمانروا اور حاکم میں گرفتار ہو جائے۔

جب یزیدیت برسر اقتدار آ جائے تو دین کی چھٹی ہے۔ دین کیلئے فاتحہ پڑھ دیں کیونکہ دین ختم ہو جائے گا۔نماز پڑھتے ہوئے دیکھنے کے باجود، حج دیکھنے کے باوجود، عبادتیں دیکھنے کے باوجود دین محفوظ نہیں ہے لہٰذا اس دھوکا میں نہ آنا کہ ہم نمازیں پڑھ رہے ہیں تو کس نے کہا ہے کہ دین محفوظ نہیں ہے؟ یا اہل مدرسہ یہ سوچ رہے ہیں کہ جب ہم درس و بحث پڑھ پڑھا رہے ہیں تو کس نے کہا کہ دین محفوظ نہیں ہے؟

ہر شے کا تحفظ اس کے اپنے مقام پر قائم ہونے سے ہوتا ہے۔اگر وہ اپنے مقام پر نہیں تو محفوظ نہیں ہے مثلاً انسان کی ناموس، بہن اور بیٹی کہاں محفوظ ہوتی ہیں؟ یہ اگر گلی میں آ جائیں اور خدانخواستہ کوئی متجاوز و

---

[1]......(بحار الانوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء ٤٤، صفحہ ٣٢٦)(الملهوف علی قتلی الطفوف - سید ابن طاؤوسؒ، صفحہ ٩٩)

فاسد انسان ان کی عزت وآبرو کے درپے ہو تو ناموس موجود تو ہیں لیکن محفوظ نہیں ہیں۔

پس تحفظِ دین کا معنٰی یہ نہیں کہ مدرسوں میں سر جوڑ کر بیٹھ کر پڑھیں، پڑھائیں تو دین محفوظ ہے۔ دین اس وقت محفوظ ہے جب اپنے مقام پر قائم ہو اور اس کا مقام یہ ہے کہ دین دستورِ زندگی بن جائے۔ جب تک دین زندگی میں نہیں آتا، دستور وطرزِ حیات نہیں بنتا اس وقت تک غیر محفوظ ہے۔ اسی کو دیانت کہتے ہیں کہ دین عملی شکل بن کے زندگی میں آجائے لہٰذا تحفظ دین خصوصاً نظریاتی اور عقیدتی تحفظ دینداروں کے تحفظ سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

سکیولرازم، دین کو اپنے مقام سے ہٹا کر اس کو نابود کرنے کے درپے ہوتا ہے۔ یہ بہت منحوس طریقہ ہے جس سے دینی عقیدتوں کو خود دینداروں کے اندر اور دینداروں کے ذریعے ہلایا جارہا ہے۔ یہ دین کشی، نسل کشی اور انسانیت کشی ہے۔ بعض اوقات ایسی تابناک شعائیں کسی جگہ پر آجاتی ہیں لیکن لوگوں کو احساس نہیں ہوتا کہ کتنا بڑا فاجعہ رونما ہوا ہے جیسے روس میں چرنوبل (Chernobyl) کا واقعہ یا ہندوستان میں آیوڈھیا (Ayodhya) شہر کے کارخانہ سے زہریلی گیس نکلنے کا سانحہ کہ جس میں دھماکہ نہیں ہوا لیکن ایسی زہریلی گیس خاموشی سے پھیل گئی کہ رات ہی رات سوئے ہوئے لوگ ہمیشہ کے لئے سو گئے۔ ہم اسے بڑا فاجعہ سمجھتے ہیں جس میں آواز بھی ہو۔ وہ اتنا بڑا فاجعہ وحادثہ نہیں ہوتا بلکہ سب سے بڑا فاجعہ وہ ہے جو خاموش وساکت لیکن تباہ کن اور ویران گر ہو۔ اس وقت دین کے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔

فصل سوم

سکیولرازم کی تاریخی بنیاد اور اسلام میں نفوذ کی کوشش

سکیولرازم، غرب کا تحفہ

سکیولرازم ایک تباہ کن مکتب ہے جس سے دینی تہذیب کا خاتمہ یقینی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اسے کس نے جنم دیا؟ یہ کن علل واسباب کی وجہ سے وجود میں آیا؟ اور پھر اسلامی سرزمینوں تک کیسے آیا؟

دراصل سکیولرازم ایک وارداتی اور Imported چیز ہے جس کا اسلامی تہذیب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تفکر مسیحیت کے اندر غرب میں وجود میں آیا اور پھر آہستہ آہستہ یہاں تک آ پہنچا۔ جو قومیں تہذیب وتمدن اور کلچرل (Cultural) لحاظ سے فقیر ہوتی ہیں وہ ہمیشہ دوسروں کے سامنے دستِ گدائی پھیلاتی ہیں۔ جو پیسے مانگتا ہے وہ سب سے بڑا گدا نہیں ہے بلکہ سب سے بڑی اور بری گدائی، تفکر، تہذیب اور کلچر کی گدائی ہے۔ فقیر ترین اور رسواترین معاشرہ وہ ہے جو تفکر، نظریات، اعتقادات اور طرزِ حیات دوسروں سے لیتا ہے۔ خصوصاً مسلمان معاشرہ کہ جس کے پاس اسلام جیسی غنی اور انسان ساز تہذیب موجود ہے اگر پھر بھی دوسروں کی تقلید کرنا شروع کرے، دوسروں سے طرز حیات اور تمدن سیکھنا شروع کرے تو یہ سب سے بری گدائی ہے۔ جیسا کہ کوئی بڑا سرمایہ دار گدائی کرے تو یہ اس کے لئے ننگ وعار ہے۔ وہ قومیں جو تہذیب وتمدن کے لحاظ سے فقیر ہوں، جن کے پاس صرف تفکر کے جھونپڑے ہوں، جنہوں نے تفکر کے محل نہ بنائے ہوں وہ تہذیبوں کے سیلاب میں بہہ کر چلی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ سیلاب میں ہمیشہ غریب کی جھونپڑی ہی گرا کرتی ہے ورنہ کوٹھیوں اور بنگلوں والے کبھی بھی سیلاب کا شکار نہیں ہوتے۔

لہٰذا سکیولرازم جو نظریاتی سیلاب کا ایک تباہ کن ریلہ ہے غرب سے ہوتا ہوا یہاں تک آ پہنچا ہے۔ سکیولرازم جیسے ہزاروں پلید عناصر، افکار اور نظریات یہودیت ومسیحیت سے اسلامی زمینوں تک منتقل ہوگئے ہیں۔ یہ ایک پورا باب ہے جس کو ''اسرائیلیات'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اسرائیلیات

صدر اسلام سے ہی اسلام کو اسرائیلیات کا خطرہ درپیش تھا۔اسرائیلیات ایک خاص قسم کا تفکر ہے جسے انہوں نے اسلام کا حصہ بنایا۔اسلام کے آغاز ہی سے مدینے میں جب یہودیوں اور اسرائیلیوں کے ساتھ پالا پڑا اسی وقت سے انہوں نے اسلام کے اندر نفوذ اور رخنہ ایجاد کر کے مختلف تدبیروں وحیلوں کے ذریعے اپنے سابقہ دین کو اسلام میں داخل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

بعض یہودیوں نے مسلمان ہونے کے بعد یہودیت کے افکار اسلام میں داخل کرنا شروع کئے جبکہ بعض دوسرے لوگوں نے مسلمان ہوئے بغیر اسرائیلی افکار، اعتقادات ونظریات اسلام میں ڈالنے شروع کئے۔اس طرح بہت سارے یہودی ومسیحی عقائد وافکار اسلام کے اندر لائے گئے اور انہیں اسلام کا حصہ قرار دیا گیا۔احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں ان کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ان تمام افکار، نظریات واعتقادات کے مجموعے کا نام اسرائیلیات ہے۔

خصوصاً علم حدیث کے اندر ایک بہت بڑا مجموعہ بنامِ اسرائیلیات موجود تھا۔علماء کی کاوشوں اور کوششوں سے ان احادیث کی شناخت ہوئی کہ یہ احادیث اسلامی نہیں بلکہ اسرائیلی من گھڑت احادیث ہیں لیکن پھر بھی کچھ مسائل اسرائیلیات کے نام سے ابھی بھی موجود ہیں۔یوں نہیں کہ جو کچھ اسرائیلیات اسلام میں داخل کی گئی تھیں وہ علماء نے بال کی طرح نکال کر باہر پھینک دیں البتہ انہوں نے اپنی کوششوں سے جہاں تک ہوسکا یہ کام کیا۔ان احادیث کو یہودیوں نے اسلامی رنگ دے کر اسلام میں داخل کیا ہے۔

اسرائیلیات کا جدید نمونہ، دین کے ساتھ مسیحی ارتباط

اسرائیلیات فقط احادیث، اعتقادات اور تاریخ کی حد تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان کا عمل دخل اور اثر مسلمانوں کی زندگی، طرزِ تفکر، رہن سہن، بودوباش اور تہذیب وتمدن میں بھی پایا جاتا ہے۔یعنی اُس زمانے سے آج تک مسلسل ان کی مداخلت جاری ہے۔بنی اسرائیل نے مسلمانوں کے ساتھ برے سلوک کے ساتھ

اسلام کے ساتھ یہ رویہ جاری رکھا کہ اسلامی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کیا تا کہ ان کی افادیت کو کم سے کم کر دیں۔

اسرائیلیات کا جدید نمونہ، دین کے ساتھ مسیحی ارتباط

اگر آج مسلمانوں کے درمیان پائی جانے والی نام نہاد اسلامی تہذیب کی بنیادوں کو تلاش کیا جائے تو اس میں تقریباً دس فیصد اسلام اور نوے فیصد اسرائیلیات کا عمل دخل ہے۔ ہماری زندگی اسلامی کلچر سے زیادہ اسرائیلی کلچر سے ملتی جلتی ہے لہٰذا اسرائیلی مداخلت ہر لحاظ اور ہر زاویے سے ہوئی اور ہو رہی ہے۔ یوں نہیں کہ کسی ایک زمانے میں تھی پھر رک گئی۔ یہ ایک داستانِ دراز ہے جس کے لئے الگ فرصت چاہئے کہ ہم تشخیص دیں کہ اس زمانے میں وہ کون کون سے امور ہیں جو اسرائیلیات کے نام سے مسلمانوں کی تعلیمات اور تفکرات میں موجود ہیں۔

ایک معمولی سی مثال پہ غور فرمائیں تو معلوم ہوجائے گا کہ اسرائیلیات کا ہماری زندگی اور تہذیب وتمدن پر کتنا اثر پڑا ہے۔ اسرائیلیات میں مسیحیت اور یہودیت کا کوئی فرق نہیں۔ اگر چہ یہودی اسلام کے ساتھ بہت زیادہ عناد و دشمنی رکھتے ہیں لیکن مسیحی بھی کسی لحاظ سے پیچھے نہیں ہیں۔ وہ مثال یہ ہے کہ ہم مسلمانوں نے دین کے ساتھ مسیحی طرزِ ارتباط قائم کیا ہے۔

مسیحی طرزِ ارتباط یہ ہے کہ آپ دن بھر، ہفتہ بھر، سال بھر یا حتیٰ عمر بھر جو کچھ بھی کرنا چاہیں آزادی کے ساتھ کرتے رہیں۔ کھل کر گناہ، آلودگیاں، فساد اور قباحتیں انجام دیتے رہیں لیکن جب آپ کو اندر سے احساسِ ندامت ہونا شروع ہوجائے، جب ضمیر ملامت کرنا شروع کر دے، اندر سے ڈسنا شروع کر دے، نفس کے اندر بے چینی واضطراب کا احساس پیدا ہو تو اس کے تدارک کا ذریعہ یہ ہے کہ اس نفسیاتی الم سے بچنے کے لئے کسی دینی مرکز میں جا کر چند دینی رسومات انجام دے دیں۔ وہ دینی رسومات اتنا اثر کریں گی کہ آپ کے اندر گناہ کے نتیجے میں جو بے چینی واضطراب کا عالم ایجاد ہوا تھا خود بخود ختم ہوجائے گا اور آپ کو ایک سکون اور آرام محسوس ہوگا۔ یعنی نفسیاتی تسکین کے لئے مذہب کو اختیار کرنا۔ یہ دین کا مسیحی مصرف اور مسیحی طرزِ ارتباط ہے۔

یعنی وہی چیز جو آج کل بعض معاشروں میں مے گساری میں نظر آتی ہے۔ منشیات کی ایک بڑی علت

ماہرین یہ بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کے نفسیاتی الجھنیں مثلاً زندگی کے اندر ناکامیاں، بے چینیاں اور بہت ساری مشکلات ہیں۔ جب یہ بے چینیاں نفسیاتی کرب واذیت میں تبدیل ہوجاتی ہیں تو اس وقت انسان ان سے آزادی حاصل کرنے کے لئے کوئی راستہ ڈھونڈتا ہے۔ جب اسے کوئی راستہ نہیں ملتا تو وہ بے حسی اور مدہوشی کے عالم میں آ کر کچھ دیر کے لئے ان الجھنوں سے فرار کرتا ہے لہٰذا ہر نشہ آور چیز کا استعمال کر کے اپنے آپ کو تھوڑا سا مصنوعی سکون دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اکثر مے گسار اور نشئی درحقیقت زندگی کی مشکلات سے تنگ آ کر اس طرف آجاتے ہیں۔ بہت کم لوگ ہیں جو دوسری وجوہات کی بناء پر اس دلدل میں پھنستے ہیں۔

اگر آپ منشیات کی روک تھام چاہتے ہیں تا کہ معاشرہ منشیات سے پاک ہوجائے تو اس کے لئے یہ راہِ حل اور تجویز نہیں ہے کہ منشیات کے عادی انسانوں کا علاج معالجہ کریں، انہیں مختلف دوائیں دیں تا کہ ان کے اندر مقاومت پیدا ہو اور وہ منشیات کو ترک کر دیں بلکہ تجویز یہ ہے کہ لوگوں کی مشکلات حل کریں، مسائل اور بے روزگاری کا خاتمہ کریں، گھریلو جھگڑے، خاندانی چپقلشیں، معاشرتی اور معاشی مشکلات کا راہِ حل ڈھونڈیں تا کہ ذہنی پریشانیاں دور ہوجائیں۔ اگر لوگوں کی زندگی میں حقیقی سکون آجائے تو مصنوعی سکون کے پیچھے کوئی نہیں جائے گا۔

کہتے ہیں مذہب کا بھی یہی استعمال ہے۔ یعنی مسیحی استعمال، مسیحی تفکر یا دین کے ساتھ مسیحی طرزِ ارتباط اسی بناء پر ہے کہ جو مرضی ہے آزادی کے ساتھ اپنے تمام غرائز کو تسکین دیں۔ جتنی آلودگی میں آگے جاسکتے ہیں چلے جائیں اور اگر یہ آلودگیاں ایک دن ڈسنا شروع کردیں، نفسانی سکون خراب ہو کر احساسِ حقارت میں بدلنا شروع ہوجائے، ضمیر ملامت کرنا شروع کردے تو اس احساسِ حقارت کو ختم کرنے اور دوبارہ نفسانی سکون حاصل کرنے کے لئے کسی مذہبی جگہ پر چلے جائیں۔ وہاں چند لمحے گزار کے کچھ پیسہ، ہدیہ اور نذر و نیاز بھی دے دیں۔ اس کے نتیجے میں آپ کو قلبی سکون محسوس ہوگا اور ہفتہ بھر کی بے چینی چین میں بدل جائے گی۔ یعنی مے گساری کی جگہ مذہب استعمال کرو اور مذہب سے سکون حاصل کرو لہٰذا مذہب کو منشیات کے بجائے استعمال کرنے کا وہی نتیجہ ہے جو منشیات کا ہے۔ اگر ایک انسان کلیسا میں جائے اور ایک شراب خانے

میں جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ دونوں کی ایک ہی مشکل ہے۔ دونوں کے ضمیر کو چین نہیں ہے لہٰذا کلیسا یا شراب خانے میں جانے سے دونوں سکون اور ہلکا پن محسوس کرر ہے ہوتے ہیں۔

پس دین سے مسیحی طرزِ ارتباط یہ ہے کہ مذہب سے وہی اثر حاصل کرلینا کہ جو مے گساری سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ مذہب افیون ہے۔ مذہب ایک نشہ آور چیز ہے۔ مذہب لوگوں کو مست کرنے کے لئے ہے۔ یعنی ایک مصنوعی سکون ملتا ہے جبکہ حقیقی مشکلات وہیں رہتی ہیں۔ کمیونزم (Communism) اور سوشلزم (Socialism) کے دور میں دین ستیزی اور دین کو ختم کرنے کے لئے جو سب سے بڑا ہتھیار استعمال کیا گیا وہ یہی تھا کہ انہوں نے مذہب کو افیون کا نام دیا۔ مسیحی طرزِ ارتباط کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مذہب افیون ہے۔

لیکن مسلمانوں نے بھی بنی اسرائیل کی دیکھا دیکھی وہی طرزِ عمل اپنانا شروع کیا اور ذہنی سکون کے لئے مذہب کو استعمال کرنا شروع کردیا۔ ہفتہ بھر جو مرضی آئے کریں پھر آخر میں نماز جمعہ میں شرکت کریں تو ایک سکون سا محسوس ہوتا ہے، مہینہ بھر جو کچھ کرتے رہیں لیکن مہینہ کے بعد کسی فقیر کو صدقہ دے دیں، سال بھر جیسے چاہیں جئیں لیکن دس دن عزاداری کریں، ماتم میں شرکت کریں تو سال بھر کے لئے سکون حاصل ہو جائے گا یا عمر بھر حرام کما کر اور سود کھا کر جب احساسِ جرم ہونے لگے تو حج پہ چلے جائیں۔

لہٰذا سال بھر دین کے ساتھ ارتباط رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے فقط سال میں تھوڑا سا وقت نکال کر کچھ دینی اعمال یا رسومات انجام دے دیں تو وہی سکون جو چاہئے تھا حاصل ہو جائے گا۔ دین کے ساتھ ایسا ارتباط رکھنا اسلامی ارتباط نہیں ہے۔ یہ طرزِ ارتباط ایک اسرائیلیت ہے جو مسیحیت سے مسلمانوں میں سرایت کرگئی ہے۔

یہ اسرائیلیات کا ایک جدید نمونہ ہے لہٰذا اسرائیلیات کے بہت سے نمونے مسلمانوں کے اندر موجود ہیں۔ اگرچہ علماءِ اسلام نے زحمت کرکے احادیث، اعتقادات اور تاریخ سے اسرائیلیات کو کسی حد تک خارج کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ اسرائیلیات ہیں لیکن بہت سی اسرائیلیات شعوری طور پر اور کچھ لاشعوری طور پر ہمارے کلچر

کا حصہ بن گئی ہیں۔ ان میں سے ایک ارمغان سکیولرازم کے نام سے ہے کہ جس کی جڑیں اور شاخیں بنی اسرائیل اور خصوصاً مسیحیت میں پائی جاتی ہیں۔ اب کوشش کی جارہی ہے کہ سابقہ تجربات یا نمونوں کے مطابق اس چیز کو اسلام کے ساتھ جوڑا جائے۔

یہ الگ بحث ہے کہ اسلام میں سکیولرازم کی کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟ یعنی وہ اسباب و علل جن کی وجہ سے مسیحیت کے اندر سکیولرازم وجود میں آیا کیا اسلام میں بھی پائے جاتے ہیں یا نہیں؟ چوتھی فصل میں ان اسباب کا اسلام اور مسیحیت میں تقابلی جائزہ کا بیان تفصیل کے ساتھ آئے گا لیکن پہلے کچھ مطالب مقدمہ کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔

کلیسا کا عروج

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دین مسیحیت کو بہت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس کے کیا عوامل تھے یہ ایک الگ بحث ہے لیکن دین مسیحیت بہت پھیلا حتیٰ ظہور اسلام کے وقت بھی ایک موفق ترین دین تھا۔ آج بھی مسیحیت کسی حد تک کامیاب مکتب و مسلک کے طور پر موجود ہے یعنی ایک بہت بڑی تعداد نے اسے دین کے طور پر قبول کیا ہے۔ مسیحیت کی کامیابی کا ایک نمونہ یہ ہے کہ ایک زمانے میں پورا براعظم یورپ دینِ مسیحی کے تحت آ گیا۔

اکا دکا افراد دین مسیحی سے ہٹ کر کسی اور دین سے تعلق رکھتے تھے لیکن براعظم یورپ کا اکثریتی دین، دین مسیحیت تھا۔ یورپ میں دین مسیحیت کی اس بے مثال کامیابی سے ارباب دین اور کلیسا کے ذمہ دار افراد نے بہت فائدہ اٹھایا۔ یہاں تک انہوں نے دین مسیحیت کے نام پر زندگی کے ہر شعبہ کو تحت تاثیر قرار دیا۔ یہ لوگ اس حد تک اثر انداز ہوئے کہ حکومت بھی دین اور چرچ کے تابع ہوگئی۔

بادشاہ کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات وحرکات بھی پاپ کی اجازت سے انجام پاتی تھیں۔ رشتوں کا لین دین، سیاسی اور غیر سیاسی رسومات سب کی سب پاپ کی اجازت سے انجام پاتیں حتیٰ کہ

تاج گزاری کے مراسم بھی پاپ کے ہاتھوں انجام پاتے تھے۔ مالیات کا حکومتی وغیر حکومتی نظام بھی پاپ اور چرچ کے اختیار میں تھا۔ وہ لوگوں سے کسی نہ کسی بہانے مالیات وصول کرتے تھے مثلاً کچھ مالیات حکومتی فنڈ کے طور پر، کچھ دینی فنڈ کے طور پر اور کچھ جرمانہ کے طور پر حتیٰ کہ کلیسا بہت بڑی بڑی املاک کا مالک بن گیا۔

اگر چہ بظاہر کبھی بھی پاپ شہنشاہ نہیں بنا لیکن شہنشاہ سے کہیں زیادہ بالاتر اس کی قدرت تھی۔ شہنشاہ اس کے ایک شعبہ کا کارندہ سمجھا جاتا تھا لہٰذا پاپ کو ایک فوق العادہ قدرت حاصل تھی اور اس قوت کو باقی رکھنے کے لئے انہوں نے مختلف قوانین بنائے، پابندیاں عائد کیں، دین مسیحیت میں ردوبدل کیا، کچھ چیزوں کا انکار کیا اور کچھ چیزوں کو دین کے نام پر رائج کر کے لوگوں کو اس کا پابند بنایا۔ اس طریقہ سے انہوں نے لوگوں کی زندگی میں بہت زیادہ مداخلت کرنی شروع کردی تا کہ لوگوں کو اپنے زیر نظر رکھ سکیں۔ کسی شخص کی معمولی سی حرکت بھی ان کی نظروں سے ڈھکی چھپی نہیں رہتی تھی بلکہ فوراً ان کی اطلاع میں آجاتی تھی۔ اگر وہ تشخیص دیتے کہ یہ حرکت کلیسا یا پاپ کے اثر ورسوخ کے خلاف ہے تو اس کا فوراً نوٹس لیا جاتا اور چھوٹی چھوٹی حرکات پر بہت بڑی بڑی سزائیں دی جاتی تھیں۔

اس سلسلے میں انہوں نے تحریف مسیحیت کے علاوہ بھی کئی اقدامات کیے مثلاً کلیسا کی Imperium اور شاہی کو باقی رکھنے کے لئے عقلی کاوشوں پر قدغن لگادی اور عقل کو دین کے مخالف قرار دیا۔ انہوں نے علمی تحقیقات، تجربات اور انکشافات پر پابندی لگادی۔ یہ ایک نظام تھا جو کئی صدیوں تک جاری رہا جسے آج ہم قرونِ وسطیٰ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ وہی دور ہے جب کلیسا اور پاپ کی شہنشاہیت تھی۔ اس برے دور میں کلیسا اور پاپ نے مالی وسیاسی قدرت کو اپنے ساتھ منحصر رکھنے کیلئے ہر جائز و ناجائز طریقے سے استفادہ کیا۔

قرونِ وسطیٰ آج بھی شریعت کے لئے ایک سیاہ دور سمجھا جاتا ہے۔ لوگ جب قرون وسطیٰ کو یاد کرتے ہیں تو ان کا سر ندامت اور شرمندگی سے جھک جاتا ہے۔ اس دور میں کلیسا اور پاپ نے لوگوں پر زندگی بسر کرنا تنگ کردیا تھا۔ یہاں تک کہ لوگ یہ چاہتے تھے کہ جس طریقہ سے بھی ہو ہمیں اس ظالمانہ نظام سے

آزادی نصیب ہو۔ یہ ایک وسیع تاریخ ہے جس میں کلیسا نے دین کے نام پر یہ سب کچھ انجام دیا۔ پاپ اور کلیسا کو نہایت ہی مقدس طور پر پیش کیا گیا یہاں تک کہ پاپ کے بارے میں بات کرنا بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ کلیسا سے متعلق افراد کے لئے بھی کچھ شرائط رکھی گئی تھیں مثلاً ان کو شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

خلاصہ یہ کہ دین کے نام پر ساری قدرت یکجا ہوگئی جس سے کلیسا اور پاپ نے بہت غلط فائدے اٹھانے شروع کئے۔ یوں کلیسا فساد کا مرکز بن گیا خصوصاً کلیسا میں مالی اور اخلاقی فساد پھیل گیا۔ خود فساد میں مبتلا ہوکر لوگوں کے معمولی معمولی جرم پر بڑی بڑی سزائیں دینا، لوگوں سے اموال چھیننا اور زمینیں ہتھیا لینا ان کا معمول اور شیوہ بن گیا تھا۔

سکیولرازم، کلیسا کے خلاف ردعمل کا نتیجہ

جب کلیسا اور پاپ نے لوگوں کو بہت زیادہ ستایا تو آخرکار لوگ تنگ آکر عکس العمل دکھانے پر مجبور ہوگئے۔ یہ طبعی قانون ہے کہ کسی بھی جگہ پر دین یا کسی بھی نام پر ناجائز طریقے سے لوگوں پر ظلم وستم روا رکھا جائے اور قبیح اعمال انجام دیئے جائیں تو وہاں بغاوت، شورش اور مخالفت کا میدان ہموار ہوتا جائے گا۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ یہ کام کسی بھی نام سے ہو مثلاً دین، ٹیکنالوجی، آزادی، مقدس یا غیر مقدس جو بھی نام ہو، اگر ان سے ناجائز فائدہ لینا شروع کر دیا جائے تو آخرکار لوگوں کی طرف سے اس کے خلاف طبعی ردالعمل کا وجود میں آنا حتمی ہے۔ جیسا کہ آج کل بھی یہ کام ہورہا ہے۔ آزادی کے نام پر لوگوں کا خون بہا کر آزادی کا تمسخر اڑایا جارہا ہے۔ اگرچہ سب سے زیادہ تمسخر دین کا اڑایا گیا ہے۔ ایک فاسق وفاجر آدمی جب دین کے بارے میں اظہار خیال کرنا شروع کردے، خود مرتد ہو لیکن لوگوں کو دین سکھانا شروع کردے تو یہ ایسے ہے جیسے ولید بن عقبہ تقویٰ کے موضوع پر بول رہا ہو۔

ولید ایک فاسق وفاجر انسان تھا جو شراب پی کر منبر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بیٹھ کر لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتا تھا۔ وہ اس قدر فصیح وبلیغ تقریر کرتا کہ لوگ حیران ہوتے تھے کہ ہم نے اس سے پہلے ایسی باتیں کسی سے

نہیں سنیں تھی، درحالیکہ شراب کی حالت میں صبح کی نماز پڑھاتا تھا۔نشہ کی وجہ سے دو رکعت کے بجائے چار رکعت نماز پڑھاتا اور جب لوگ اعتراض کرتے ہیں تو کہتا ہے کہ اگر کم پڑھی ہے تو اور پڑھا دوں!

لہٰذا جب ایک مستکبر اور ڈکٹیٹر شخص جمہوریت یا وڈیرہ سوشلزم کے پرچار کی باتیں کرتا ہے تو ایسے ہے جیسے ولید نے دین کا تمسخر اڑایا۔مسیحیت کے اندر یہی کچھ ہوا لہٰذا کلیسا اور پاپ کے خلاف ایک طبعی عکس العمل شروع ہوا۔اس عکس العمل کے نتیجے میں افکار بنے اور افکار کے ساتھ ساتھ عملی حرکات بھی شروع ہوئیں۔ ہر سطح پر کوشش کی گئی کہ جتنا ہو سکے سیاست اور مالیات وغیرہ میں کلیسا کے اثر ورسوخ کو کم کیا جائے۔لوگوں نے کلیسا اور پاپ سے آزادی حاصل کرنے کی تدبیریں سوچیں۔اس بابت باقاعدہ کمیٹیاں بنائی گئیں اور تحریکیں شروع ہوئیں۔اس طرح مختلف طبقات میں یہ شعور پیدا ہونا شروع ہوا کہ ہمیں اس سے نجات ملنی چاہئے۔

اس سلسلے میں لوگوں نے جو نعرہ بلند کیا وہ یہ نہیں تھا کہ ہمیں ظلم سے نجات ملنی چاہئے بلکہ انہوں نے کہا کہ ہمیں کلیسا اور دین سے نجات وچھٹکارا ملنا چاہئے اور یہ ہوتا ہے مثلاً اگر کسی ہائی اسکول میں ظلم وفساد شروع ہو جائے تو لوگ یہ نہیں کہتے کہ ظلم نہیں ہونا چاہئے بلکہ کہتے ہیں اسکول نہیں چاہئے۔اسی طرح اگر مسجد سے کام شروع ہو تو لوگ کہیں گے کہ مسجد نہیں ہونی چاہئے۔یعنی جس مقام، منصب اور سیٹ پر بیٹھ کر یہ حرکت انجام دی جائے تو لوگ اسی کے مخالف ہو جائیں گے۔

ابتداء میں یہ کوشش کی گئی کہ کلیسا کے اختیارات کو محدود کیا جائے لیکن کلیسا کے خلاف لوگوں کا ردعمل آہستہ آہستہ نہضت کی شکل اختیار کر گیا۔کلیسا اور پاپ چونکہ ایک مقدس مقام تھا اور سب کچھ اس تقدس کے لبادہ میں ہو رہا تھا تو اس تقدس کے خلاف جو آواز اٹھی اس کا نام سیکولرازم رکھا گیا۔

سب سے پہلے جو سیکولر تحریک چلی وہ یہ تھی کہ کلیسا کے اختیارات کو حکومتی سطح پر کم کیا جائے پھر علوم کی ترویج شروع ہوئی چونکہ کلیسا علوم، تحقیقات وجدید انکشافات کی مخالفت کرتا تھا اور ہر نئے نظریہ کو نامقدس سمجھ کر رد کر دیتا تھا۔آہستہ آہستہ علوم اور تحقیقات کی حمایت میں ایک تحریک اٹھی اور اس کا نام بھی سیکولر تحریک رکھا گیا پھر عقلانیت اور عقل گرائی (عقل پسندی) کی حمایت میں تحریک اٹھی لہٰذا اسی طرح مرحلہ وار یکے بعد دیگرے

سکیولر تحریکیں اٹھتی اور چلتی رہیں۔ان سب میں مشترک نقطہ یہی تھا کہ یہ سب کلیسا اور پاپ کے تقدس کے خلاف تھیں لہٰذا سکیولر کے نام سے مشہور ہوگئیں۔

یہ سارے امور باعث بنے کہ آخر کار کلیسا کا رعب ودبدبہ اور تسلط ختم ہوگیا۔آخر میں جو چیز نتیجے میں آئی وہ یہ تھی کہ دین کو تو سرے سے ختم نہیں کیا جاسکتا لیکن اسے لوگوں کی عملی زندگی سے بے دخل کر دیا جائے تا کہ دیندار لوگوں کا دوسرے لوگوں سے کوئی تعلق نہ رہے اور اس طرح ان کی زیادتیوں سے چھٹکارا مل جائے گا لہٰذا اس زمانے کے کلیسا شہر سے باہر بنائے جاتے ہیں تا کہ یہ لوگ آبادیوں سے دور رہیں۔ باہر صحراؤں میں جو مرضی ہے کرتے رہیں، شادی کریں یا نہ کریں، اتوار کو عبادت کریں یا نہ کریں، جیسے بھی رہیں لیکن لوگوں میں نہ آئیں البتہ یہ بھی قدغن نہیں کہ لوگ وہاں نہیں جاسکتے بلکہ جس کا جی چاہے اس کو اجازت ہے کہ وہ اپنی تسکین روح کے لئے کلیسا جاسکتا ہے۔تھوڑی سی عبادت کر کے پھر اپنی زندگی میں واپس آجائے۔

لہٰذا سکیولر تحریکوں نے بھی دین کے خاتمہ کا نعرہ بلند نہیں کیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اس نعرے سے ان کی تحریکیں کامیاب نہیں ہوسکتی تھیں۔پس انہوں نے دین، دینی مدرسوں، دینی سلیبس اور دینی رسومات کو زندگی سے بالکل الگ کر دیا۔ان لوگوں نے کہا کہ زندگی بسر کرنے کے لئے لوگوں کو آزاد چھوڑا جائے لیکن چونکہ انسانی حیات قوانین اور اخلاقی وحقوقی ضوابط کے بغیر نہیں چل سکتی لہٰذا انہوں نے کہا کہ ہمارے مفکرین، سکالرز اور روشن فکر نشاندہی کریں گے کہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے کیسا نظام ہونا چاہئے؟ ان کی مدد سے ہم طرزِ حکومت، سیاست، معیشت، عدالت، تعلیم اور گھریلو رسم ورواج کا نظام خود سوچ کر بنالیں گے لہٰذا انہوں نے ایسا ہی کیا۔

اس سکیولر نہضت نے جو آخری مرحلہ طے کیا وہ انقلاب فرانس کی صورت میں تھا کہ جس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دین، کلیسا اور پاپ کی مداخلت پر قدغن لگادی گئی۔سکیولرازم نے جب اس مرحلہ کو کامیابی سے طے کیا تو اس کے بعد ایک مکتب، مذہب اور آئیڈیالوجی کے طور پر آگے بڑھا۔

سکیولرازم کی کامیابی میں دین ستیز طبقہ کا کردار

اس میں شک نہیں کہ سکیولرازم کی پیدائش کے لئے کلیسا اور پاپ نے بنیادی کردار ادا کئے ہیں۔ انہوں نے اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سکیولرازم کے لئے میدان ہموار کردیا۔ جب کلیسا کے خلاف لوگوں نے سکیولر تحریکیں چلانا شروع کیں تو اس دوران ایک اور طبقہ بھرپور طریقہ سے میدان میں اتر گیا۔ یہ دین ستیز، دین مخالف و دین دشمن طبقہ تھا جو ملحدانہ ومعاندانہ خیال اور دین سے نفرت رکھتا تھا۔ یعنی وہی سرمایہ دار و جاگیردارانہ طبقہ کہ جنہیں اصل دین سے نفرت تھی، نہ یہ کہ دین کی حقیقی شکل پسند کرتے تھے۔ یہ ظلم کے خلاف نہیں اٹھے کیونکہ ظلم تو بے چاری عوام پر ہو رہا تھا۔ پہلے ہی ان کی نیت میں تھا کہ دین کا خاتمہ ہوتو ہم آسودہ ہو جائیں گے۔

لہٰذا جب دینی مراکز اور دینی افراد وغیرہ میں کمزوریاں پیدا ہوئیں تو انہوں نے اس کی خوب ترویج کی، چھوٹے چھوٹے مسائل کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کیا مثلاً کسی دور دراز جگہ پر کلیسا میں کوئی غلطی ہوتی تو یہ لوگ اس کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے اور لوگوں کو اس کے خلاف ابھارتے تھے۔ یعنی جلتی آگ پر تیل ڈالتے تھے۔ ان لوگوں کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں دین کے خلاف احساسات ابھار دیئے جائیں اور دین کو زندگی سے باہر نکال دیا جائے لہٰذا اس طبقہ نے بہت بڑا کردار ادا کیا اور اس کے بہت سے شواہد بھی ہیں کہ یہ کون لوگ تھے جبکہ بعض کے نام بھی مشخص ہیں۔

سکیولرازم کا رخ اسلام کی طرف

سکیولرازم نے مسیحیت کو فتح کرنے کے بعد اسلام کی طرف رخ موڑ لیا ہے چونکہ اسلام بھی ایک دین ہے، البتہ یہودیت میں سکیولرازم کا تصور نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودیت کے نام پر کبھی بھی کوئی معاشرہ وجود میں نہیں آیا۔ شاید پہلا معاشرہ اسرائیل، یہودیت کے نام پر وجود میں لایا، ورنہ یہودی کبھی بھی کامیاب نہیں ہوئے کہ اپنی مملکت و نظام بنا سکیں یا کسی معاشرے میں اکثریتی مذہب بن کر ابھرے ہوں۔ خود

اس مذہب کے اندر ایسی رکاوٹیں ہیں کہ یہ اکثریتی مذہب نہیں بن سکتا۔ انہوں نے دوسروں کیلئے دروازے بند رکھے ہوئے ہیں لہٰذا انہوں نے فوراً سکیولرازم کا رخ اسلام کی طرف رخ موڑ دیا۔

یہ بہت جالب داستان ہے کہ انہوں نے سکیولرازم کا رخ اسلام کی طرف کیسے موڑا؟ اس کام کیلئے انہوں نے وہ سب چیزیں اور حالات اسلام میں مصنوعی طور پر پیدا کرنے کی کوشش کی جو مسیحیت کے اندر حقیقی طور پر موجود تھے۔ اس منصوبہ پر انہوں نے کافی عرصہ کام کیا اور مختلف گروہ تشکیل دیئے۔ کسی گروہ کو چرچ کا کردار اپنانے کیلئے کہا، کسی گروہ کو دہشت گردی اور مذہبی منافرت پھیلانے پر مامور کیا اور کسی گروہ کو کوئی اور کام سونپا گیا۔ مجموعی طور پر اسلام میں وہ حالات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ جن کا حتمی نتیجہ سکیولرازم ہے۔

سکیولر تحریک کے دوران حالات اس قدر سخت تھے کہ خود دیندار مسیحیوں نے اٹھ کر سکیولر تحریک چلائی۔ خود مسیحیوں نے مطالبہ کیا کہ مسیحیت سے ہماری جان چھڑائی جائے۔ اسی طرح گزشتہ چند برسوں سے جو کچھ ہمارے ملک میں ہو رہا ہے یہ سب اس کے لئے ہے تا کہ مسلمان دین سے خود بخود بیزار ہو جائیں۔ خود مسلمان مطالبہ کرے کہ ہمیں اس مذہب سے تنفر ہے۔ ہمیں اس مذہبی دہشت گردی سے نجات دے دیں پھر بے شک ان سے کہیں کہ اگر دین میں نہیں رہو گے تو آخرت میں جہنم ہے۔ وہ کہیں گے کہ آخرت کی جہنم ہمیں قبول ہے لیکن یہ دین جو ہمیں مروا رہا ہے، قبول نہیں ہے۔

جب تک ایسے حالات پیدا نہ ہو جائیں کہ دین کی موجودہ شکل جہنم سے بدتر ہو جائے اور دیندار انسان جہنم کو دین پر ترجیح دینے لگے تو سکیولرازم کیلئے ماحول سازگار نہیں ہوتا۔ یہ بیٹھے بیٹھے اور محض پروپیگنڈہ سے نہیں ہوتا۔ وہ حالات اسلام کے اندر مصنوعی طور پر پیدا کئے گئے ہیں اور یہ تائثر دینے کی کوشش کی گئی کہ اسلام بھی اسی نقطہ پر جا پہنچا ہے جہاں مسیحیت جا پہنچی تھی لہٰذا اسلام کا انجام وہی ہونا چاہیئے جو مسیحیت کا ہوا۔

مذہبی دہشت گردی، مساجد اور امام بارگاہوں میں بے گناہ نمازیوں اور عزاداروں کو قتل کرنا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جب تمام کڑیاں آپس میں ملائیں تو سمجھ میں آئے گا کہ کیسے ایک مسلمان پاکستان میں بیٹھ کر یہ مطالبہ کرتا ہے یا جب یہ نعرہ سنتا ہے تو اس کو پسند آتا ہے کہ سکیولرازم ہمارے لئے اچھا ہے اور یہ

ہونا چاہئے! کن حالات سے اس کو دوچار کیا گیا کہ یہ خود سیکولرازم کا مطالبہ کرنے لگا!

البتہ ہر مملکت اسلامی میں ایک خاص پراجیکٹ شروع کیا گیا۔ دین کے نام پر قتل وغارت اور دہشت گردی اسی سیناریو (Scenario) کا ایک حصہ ہے۔ اس کے ذریعے یہاں تک پہنچانا مقصود تھا کہ ایک دن خود مسلمان بول اٹھے کہ مجھے دین نہیں چاہئے۔ دہشت گردی کے ذریعے فقط ایک گروہ کی تعداد کو کم کرنا اور چند جانیں لینا مقصود نہیں تھا بلکہ اس نتیجے پر پہنچانا تھا کہ دین کے نام پر مساجد میں نمازیوں پر گولیاں چلادو، مساجد، امام بارگاہوں، مجالس، جلوسوں اور مقدسات پر حملے کرو پھر جب کوئی پوچھے کہ یہ کیوں کر رہے ہو؟ تو دہشت گرد یہ کہے گا کہ ہمارا دین یہ کام کرنے کا کہتا ہے، ہمیں مذہب نے کہا ہے کہ بے گناہ چھوٹے بچوں اور عورتوں کا قتل عام کرو اس لئے کہ یہ کافر ہو گئے ہیں، یہ ہمارے مذہب کو نہیں مانتے تو انہیں قتل کر دو!

یہ ایک حرکت تھی جو شروع ہوئی اور ابھی بھی جاری ہے۔ اگرچہ وہ اسلام اور قرآن میں تحریف نہیں کر سکے لیکن مختلف من گھڑت مذاہب پیدا کر کے اسلام کو ان ہی حالات سے دوچار کرنے کی کوشش کی گئی جن سے مسیحیت دوچار ہو چکی تھی۔ ہر سال ہر خطہ پر نیا فرقہ وجود میں آیا۔ ہر شخص کے جو ذہن میں آیا اس نے گروہ بنالیا پھر شدت کے ساتھ فرقہ وارانہ تعصب کو ہوا دی گئی اور اس تعصب کے نتیجے میں لگی ہوئی آگ میں بے گناہ مسلمانوں کا جلنا اور جلانا اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

پھر سب سے بڑھ کر آخری مرحلہ یہ طے پایا کہ بعض دینی تعلیمات کو بہت زیادہ اجاگر کر کے ان کی شکل مسخ کی گئی مثلاً پاکستان کی سرزمین پر جو تجربہ ہوا وہ جہادی کلچر پیدا کرنا تھا۔ ہر جگہ جہاد جہاد کی آوازیں گونجنے لگیں۔ غور طلب بات ہے کہ جہاد کروانے والے لوگ کون تھے؟ جہادی گروپوں کی مدد کرنے والے قطعاً مذہبی لوگ نہیں تھے بلکہ غیر مذہبی لوگ آئے اور انہوں نے جہادی کلچر پیدا کرنے میں بڑا سرمایہ صرف کیا۔ انہوں نے نادان مسلمانوں کے دینی احساسات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں جہاد پر اکسایا۔ اسی غیر مذہبی ذہنیت نے کھل کر جہادی کلچر پیدا کرنے میں بڑا رول ادا کیا پھر اس کی ترویج کرتے کرتے اس حد تک جا پہنچایا کہ ایک ہی رات میں اسے دہشت گردی قرار دے دیا۔ اب لوگوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ اس

کا مطلب یہ ہوا کہ جہاد یعنی دہشت گردی!

گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد خصوصاً امریکہ میں قرآن مجید بہت زیادہ تعداد میں فروخت ہوئے حتیٰ کہ بعض نے یہ بھی بتایا کہ سالہا سال تک جو اسٹاک پڑا ہوا تھا وہ فوراً بازار میں فروخت ہو گیا حالانکہ وہاں کی زندگی ایسی ہے کہ مسلمانوں کو بھی قرآن کریم کا ایک لفظ زبان پر جاری کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ وہ اصلاً ہوش میں کم آتے ہیں کہ ان کی زبان پر قرآن کا نام آئے کیونکہ اکثر دوسرے عالم میں ہوتے ہیں۔

لیکن اس واقعہ کے بعد جتنے نسخے موجود تھے وہ سب کے سب فوراً بک گئے۔ لوگ راتوں رات نئے ایڈیشن چھاپتے جو صبح بک جاتے تھے۔ ہمارے بعض سادہ لوح مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ اس واقعہ سے جہاں مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا وہاں فائدہ بھی بہت زیادہ ہوا کہ اسلام کی ترویج ہونے لگی ہے! لوگوں نے اسلام کو پڑھنا شروع کر دیا ہے، اسلام کی طرف رغبت اور توجہ ہونا شروع ہو گئی ہے حالانکہ قطعاً ایسا نہیں تھا بلکہ وہی Scenario جو انہوں نے پہلے سے تدوین کیا ہوا تھا کہ ہم نے اسلام کا وہی انجام کرنا ہے جو مسیحیت کا ہوا تھا۔ مسیحیت کے اندر وہ سارے اسباب وعلل حقیقتاً موجود تھے لیکن اسلام کے اندر مصنوعی طور پر پیدا کرنے ہیں۔

ایک فلم تھی جو چلائی جا رہی تھی اور اب اس کے مختلف مرحلے طے ہو رہے ہیں۔ بعض مراحل طے ہو گئے ہیں۔ ان مراحل میں سے ایک مرحلہ یہی طے کیا گیا کہ پہلے جہادی کلچر بنایا گیا پھر جہاد کو دہشت گردی قرار دیا گیا اور پھر ناگہانی طور پر یہ اعلان کیا کہ اسلام وہ تہذیب ہے جس کی تعلیمات میں ٹیررازم (Terrorism) موجود ہے۔ جس کی آسمانی کتاب خود کہتی ہے کہ تم دہشت گرد ہو!

یہ تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک آسمانی کتاب اور وہ بھی مخصوصاً قرآن مجید میں دہشت گردی کی ترویج ہو! انہوں نے نشاندہی کی کہ قرآن لے کر پڑھو، جہاں بھی لفظ ''جہاد'' لکھا ہو گا اس سے مراد دہشت گردی ہے! جہاد یعنی ٹیررازم، لوگوں کو تشویش ہوئی لہٰذا مسلم و غیر مسلم نے قرآن میں ڈھونڈنا شروع کیا کہ ٹیررازم کہاں لکھا ہے؟ اس لئے قرآن کریم کے نسخے بہت بڑی تعداد میں بک گئے۔

جب لوگوں نے قرآن کریم اٹھا کر دیکھا کہ اس میں ''فَاقْتُلُوْا، قَاتِلُوْا، فَقَاتِلُوْا، جَاهَدُوْا، يُجَاهِدُوْنَ اوراس قسم کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں، جہاد کے بارے میں بہت سی آیات ہیں تو وہ پڑھ پڑھ کر حیران ہوتے ہیں کہ ہمیں تو اب پتا چلا کہ یہ وہ مذہب ہے جو لوگوں کو ٹیررازم (Terrorism) کی دعوت دیتا ہے اور دہشت گردی اس کی مقدس تعلیمات کا حصہ ہے۔

حتیٰ کہ ٹونی بلیئر نے یہ بیان دیا تھا کہ میں روزانہ اپنی مصروف ترین زندگی میں سے کچھ وقت نکال کر قرآن پڑھتا ہوں۔ اب ہوسکتا ہے کہ کوئی سادہ مسلمان یہ سمجھ بیٹھے کہ ٹونی بلیئر عنقریب مسلمان ہونے والا ہے چونکہ اس نے قرآن کریم کا مطالعہ کرنا شروع کیا ہے! حالانکہ وہ مسلمان ہونے کے لئے قرآن کریم کو نہیں پڑھتے ہیں بلکہ وہ یہ نکتہ ڈھونڈنا چاہتے ہیں کہ وہ کون سی چیز ہے کہ جسے ہم تلاش کر کے نشاندہی کریں کہ یہ اسلام کی کمزوری ہے۔ تنہا چیز جو انہیں نظر آئی وہ جہاد ہے لہٰذا انہوں نے جہاد کو ٹیررازم کا نام دے دیا حالانکہ یہ سب مصنوعی حالات ہیں جو ان ہی لوگوں نے پیدا کئے ہیں۔

پہلے جہاد کے نام سے دہشت گردی کروائی تا کہ جہاد کو دہشت گردی کہہ سکیں حالانکہ جہاد کا دہشت گردی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے لیکن مصنوعی بحران کھڑے کر دیئے گئے تا کہ وہ اپنا مطلوبہ نتیجہ حاصل کر سکیں لہٰذا آہستہ آہستہ سیکولرازم کے لئے فضا ہموار کی گئی اور مسلمان، مسیحی کی طرح مطالبہ کرنے لگا کہ دین سے میری جان چھڑائی جائے۔ یہاں تک کہ ایک متدین سیکولرازم کے آنے سے خوش ہونے لگا۔

فصل چہارم

سکیولرازم کے عوامل واسباب کا
مسیحیت اور اسلام میں تقابلی جائزہ

وہ علل واسباب جن کی وجہ سے سکیولرازم وجود میں آتا ہے شاید مسلمانوں کے اندر ہوں لیکن اسلام کے اندر قطعاً نہیں ہیں۔ یہاں ہم جائزہ لیں گے کہ وہ اسباب جو مسیحیت کے اندر موجود تھے کہ جن کا حتمی نتیجہ سکیولرازم نکلا، اسلام کے اندر نہیں ہیں اگرچہ مصنوعی طور پر پیدا کرنے کی کوششیں کی گئی ہے۔

مسیحیت میں سکیولرازم کوجنم دینے والے اسباب

بہت سارے عوامل اور اسباب نے مل کر مسیحیت کو انسانی زندگی سے نکال باہر کیا اور اس کی جگہ سکیولرازم کو نافذ کر دیا گیا۔ ان عوامل میں سے ایک بھی اسلام کے اندر موجود نہیں ہے۔ اب ہم ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں کہ یہ عوامل مسیحیت میں کیسے کارساز ثابت ہوئے اور اسلام ان اسباب سے کیسے مبرا ہے:

1- تحریف

سب سے پہلا مرحلہ جس کے نتیجے میں سکیولرازم کے لئے ماحول فراہم ہوا وہ دین مسیحیت کے اندر تحریف ہے۔ یعنی الٰہی دستورات اور فرامین الٰہی، بشری افکار و نظریات کے ساتھ اس طرح ملے کہ اب معلوم نہیں ہوسکتا کہ انجیل کی کون سی آیت خدا کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور کون سی پیروئے دین نے اپنی طرف سے اس میں شامل کر دی ہے۔ تحریف کا معنٰی بھی یہی ہے کہ کسی چیز کو اپنی صحیح ڈگر سے ہٹا کر دوسری سمت میں لگا دینا۔ دین میں تحریف کرنے سے مراد یہ ہے کہ دین میں اپنی طرف سے کمی یا زیادتی کر کے اسے اپنے مسیر سے ہٹا دینا۔

بنی اسرائیل، یہود اور مسیحی، دین میں تحریف کرنے کے بڑے ماہر ہیں اور اس کام میں ید طولیٰ رکھتے

ہیں۔قرآن کریم نے بھی ان لوگوں کی یہ صفت بیان کی ہے:

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ......[1]

یہودیوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کلمات کو ان کی جگہ سے بدل دیتے ہیں......

کلماتِ الٰہی اور آیاتِ الٰہی میں تحریف کرنا ان کی زندگی کا معمول بن چکا تھا لہٰذا حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد مسیحیوں نے انجیل میں بہت زیادہ تصرف کیا۔آج ان کے ہاں قابل قبول اور معروف انجیل کے جو چار نسخے موجود ہیں یہ چاروں آسمانی کتاب نہیں ہیں بلکہ پیروان مکتب مسیح یا حواری اور ان کے علماء نے انہیں اپنے ہاتھ سے لکھا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ تعلیماتِ خدا ہیں۔ان میں غیر معقول، خردسوز اور عقل ستیز باتیں آج بھی موجود ہیں اور اُس دور میں بھی موجود تھیں۔پھر ان غیر معقول باتوں کو طاقت کے ذریعے سے منوانا کہ اگرچہ آپ کی عقل نہیں مانتی لیکن پھر بھی ماننا پڑے گا۔

مسیحیت کے اندر شروع سے ہی اس بگاڑ کا آغاز ہوا ہے کہ کتابِ انجیل ان نامقدس ہاتھوں میں چلی گئی اور انہوں نے اس کے اندر تصرف کیا۔درحقیقت مسیحیت کے اندر بگاڑ کا یہ دروازہ کھلا تھا لہٰذا اسی دروازے سے آکر دین مسیحیت کی آسمانی اور الٰہی تعلیمات جو حضرتِ مسیح علیہ السلام لے کر آئے تھے ان کا رخ بدل دیا گیا۔

ان لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کی ذواتِ مقدسہ سے بہت ناروا نسبتیں منسوب کیں اور طعن و تشنیع کی حتیٰ کہ خدا کا جو تصور انہوں نے پیش کیا وہ اس قدر غیر معقول تصور تھا کہ جسے خود بھی نہ سمجھ سکے مثلاً انہوں نے خدا کے بارے میں ''تثلیث'' کا نظریہ پیش کیا جسے ابھی تک خود بھی بیان نہ کر سکے۔آج تک ایسا کوئی انسان نہیں ملا کہ جو کہے کہ میں سمجھ گیا ہوں کہ تثلیث سے کیا مراد ہے! ہر ایک کے ذہن میں تثلیث کا جدا اور الگ مفہوم موجود ہے۔اس طرح انہوں نے ایک پیچیدہ اور مبہم مذہب تشکیل دیا کہ جس مکتب میں خدا کا تصور ایک معما

---

[1]......(سورة النساء/٤٦)

ہے۔اب انسان اس معما کو کیسے حل کرے؟ کیسے اس کے قریب ہوکر رابطہ برقرار کرے؟اس معما کو اپنی زندگی میں کیسے محسوس کرے؟ یہ فہم سے بھی بالا بلکہ نا قابلِ فہم ہے۔

اسی طرح انہوں نے انبیاءؑ کے بارے میں بہت سے غیر معقول نظریات پیش کیے۔سب سے بڑھ کر حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں ہیں یہاں تک کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ (خدا کا بیٹا) کہا اور اسے بھی معما کی شکل میں پیش کیا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جو ہرگز عقل سے ہضم ہونے والی نہیں ہیں۔عقل کبھی بھی ان چیزوں کے سامنے تسلیم نہیں ہوتی۔ انہوں نے انبیاءؑ کو اس طرح سے بیان کیا کہ جو ہر قسم کی غلطی کر سکتے ہیں۔ ہر کام جو معمولی آدمی کرتا ہے وہ انبیاءؑ کرر ہے ہیں حتیٰ کہ وہ لوگ جس فساد میں خود مبتلا تھے اسے انبیاءؑ کی طرف منسوب کیا تا کہ لوگ ہم پر اتنی انگلیاں نہ اٹھائیں۔لوگوں کی انگشت نمائی سے بچنے کے لئے انہوں نے انبیاءؑ کا ایسا تصور پیش کیا کہ ہر نبی معاشرے کا بہت ہی عام آدمی نظر آنے لگے بلکہ ایک گناہ گار انسان نظر آئے جسے آپ سلام کرنا بھی پسند نہیں کریں گے۔

ایک نمونہ آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ سلمان رشدی لعین نے اپنی شیطانی آیات نامی کتاب میں بہت ساری چیزیں خود مسلمانوں کی کتابوں سے لی تھیں۔اس نے انبیاءؑ کی توہین کی۔وہ کوئی علمی یا تحقیقی کتاب نہیں بلکہ ایک فحش نامہ ہے لیکن اکثر منابع جو اس نے اس کتاب میں درج کیے ہیں وہ مسلمانوں کی کتابوں سے ہیں۔مختلف علماء و بزرگان نے گزشتہ تاریخی واقعات کے حوالہ سے جو کچھ لکھا ہے اس نے ان کو جمع کر کے ان سے ایک نتیجہ لیا اور انبیاءؑ کی ذات پر کیچڑ اچھالی لیکن حقیقت میں یہ اکثر وہ امور ہیں جو بنی اسرائیل نے انبیاءؑ کے بارے میں ذکر کیے ہیں پھر یہ اسرائیلیات کے طور پر مسلمانوں کی کتابوں میں بھی سرایت کر گئے۔ہم نے تو اعتراف کرلیا ہے کہ بہت سی چیزیں بنام اسرائیلیات مسلمانوں کے اندر رائج ہوگئی ہیں۔

یہاں تک یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دین مسیحیت انحراف وتحریف کے نتیجہ میں سرے سے ہی بگاڑ دیا گیا۔آج مسیحیتِ محرفہ موجود ہے کہ جس کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقی تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے لہٰذا یہ

غیر معقولیت حقیقی دین کی تحریف کا باعث بنی کہ لوگ آئیں اور اس غیر معقولیت کے خلاف قیام کریں۔ یہاں سے سکیولرازم کے لئے فضا ہموار کی گئی اور لوگوں نے تنگ آکر ایسے محرف دین کو اپنی زندگی سے باہر نکال دیا۔ سکیولرازم کی پیدائش کے لئے یہ سب سے اہم بلکہ بنیادی عنصر تھا۔

......قرآنِ کریم، تحریف سے محفوظ

قرآنِ کریم جو اسلام کا مرکزی منبع ہے ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہے۔ جو قرآن کریم اس وقت ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے یہ بعینہٖ وہی کتاب ہے جو خداوند تبارک وتعالیٰ کی جانب نازل ہوئی ہے۔ اس میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی واقع نہیں ہوئی ہے اگر چہ بعض اقوال و اشارات گوشہ و کنار میں ملتے ہیں کہ قرآن کریم میں تحریف ہوئی ہے۔ خصوصاً شیعہ امامیہ پر یہ تہمت لگائی جاتی ہے کہ یہ تحریف قرآن کے قائل ہیں لیکن حق و انصاف کی بات یہ ہے کہ بعض نادر اقوال کسی مذہب کے رسمی اعتقاد کے لئے سند نہیں بن سکتے لہٰذا شیعہ امامیہ کے اعتقادات میں کوئی بھی ایسا مدرک اور سند پیش نہیں کر سکا کہ کسی زمانے میں شیعہ رہنما اور سارے علماء نے مل کر تحریفِ قرآن کا قول اپنایا ہو بلکہ بہت سارے شیعہ امامیہ کے علماء نے مصونیتِ قرآن کے عقیدے پر عقلی اور نقلی ادلہ قائم کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن کریم میں تحریف نہیں ہوئی۔ جہاں تک اقوال اور بعض روایات کا تعلق ہے وہ اہل سنت کی کتب میں بھی ہیں اور شیعہ کی کتب میں بھی لیکن یہ روایات معتبر نہیں ہیں خواہ اہل سنت کی کتابوں میں ہوں یا اہل تشیع کی۔

بعض محققین نے جستجو کی تو معلوم ہوا کہ تحریف قرآن کی تمام روایتیں ایک ہی شخص پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے افسانے جو تاریخ میں گھڑے گئے ہیں اگر ان کی جستجو کی جائے تو وہ ایک ہی شخص پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ تحریف قرآن کا افسانہ بھی ایک ہی ذہن کی اختراع ہے اور وہ بھی نہایت ضعیف اور غیر معتمد شخص ہے۔ اس لئے ہر دور میں علماء امامیہ نے تحریف قرآن کے عقیدہ کو سختی سے رد کیا ہے۔

ورنہ جس طرح سے انجیل و تورات کا تقدس تحریف کے بہانے سے پائیمال ہوا اسی طرح قرآن کریم

کا تقدس بھی پائیمال ہو جائے گا۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قرآن حجیت سے ساقط ہو جائے گا، لوگوں کا قرآن پر ایمان متزلزل ہو جائے گا اور آہستہ آہستہ لوگوں کا قرآن کے ساتھ تعلق ختم ہو جائے گا۔ نتیجتاً قرآن انسان کی زندگی سے خود بخود باہر چلا جائے گا۔اس محرک اور انگیزے کے تحت یہ حرکت انجام پائی ہے۔

لیکن قرآنِ کریم ہر دور میں تحریف سے محفوظ رہا ہے۔قرآن کی حفاظت کے لئے صدر اسلام سے لے کر آج تک مسلمانوں نے بڑا اہتمام کیا ہے۔ ہر عصر میں ہزاروں کی تعداد میں حافظین قرآن موجود رہے ہیں۔ یہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا رہا ہے۔

...........حضرتِ ابوذرؓ اور دفاعِ قرآن

کعب الاحبار اور حضرت ابوذرؓ کا واقعہ قرآن میں تحریف نہ ہونے کی دلیل ہے۔مسلمانوں نے قرآن کریم میں ایک حرف کی کمی یا زیادتی کو بھی برداشت نہیں کیا۔ یہاں صرف ایک نمونہ ذکر کرتا ہوں۔خلیفہ سوم کے زمانے میں حضرتِ ابوذرؓ نے سرمایہ داری، ذخیرہ اندوزی اور مال پرستی کے خلاف ایک تحریک چلائی۔ حضرت ابوذرؓ قرآنی آیات بیان کرتے تھے خصوصاً سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۳۴:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍo

اور جو لوگ سونا اور چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔

اس آیت کو حضرتِ ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا شعار بنایا تھا۔آپؓ جہاں بھی جاتے تھے راستے میں اسی آیت کی تلاوت کرتے تھے۔ ذخیرہ اندوزوں کو حضرت ابوذرؓ کی یہ حرکت بڑی ناگوار گزری۔ یہ وہی مہاجرین تھے جو مکہ سے خالی ہاتھ آئے تھے اور جن کے پاس کھانے پینے کو بھی کچھ نہ تھا۔اب وہ مسلمانوں کے سب سے بڑے جاگیردار اور سرمایہ دار تھے جیسے عبدالرحمان بن عوف کہ جو خلیفہ سوم کو بنانے والی شوریٰ جو خلیفہ دوم نے نامزد کی تھی کے چیف تھے یہ بھی مکہ سے آئے تھے اور مہاجر تھے۔رسول اللہ ﷺ اور اسی طرح خلیفہ

اول و دوم کے زمانے میں بھی ان کی زندگی مفلسانہ تھی لیکن خلیفہ سوم کے زمانے میں انہوں نے اتنا سرمایہ حاصل کیا کہ جب مر گئے تو ان کی میراث کو ورثہ میں تقسیم کرنے کے لئے ماہرین کو بلانا پڑا۔حساب و کتاب اتنا وسیع تھا کہ لاکھوں کے حساب سے ریوڑ، بھیڑ، بکریاں اور گھوڑے تھے۔سونے اور چاندی کو کلہاڑوں سے توڑ توڑ کر ورثاء کے درمیان تقسیم کیا گیا۔ایک مسلمان، صحابی اور مشاور کہ جس کا اسلام کے اندر اتنا بڑا عہدہ تھا اس نے یہ زندگی اپنالی۔

یہ بہت بڑا انحراف تھا جو اس وقت پیش آیا۔حضرت ابوذرؓ نے ان لوگوں کے خلاف ایک تحریک چلائی کہ جنہوں نے دین سے فائدہ اٹھا کر اپنی جیبیں بھریں، املاک حاصل کیں اور سرمایہ بنایا۔ اب سب سرمایہ داروں نے مل بیٹھ کر سوچا کہ اس شخص سے کیسے جان چھڑائی جائے، یہ تو سب کچھ قرآن سے ثابت کرتا ہے۔

یہاں پر ان لوگوں نے کعب الاحبار کی خدمت حاصل کی جو یہودیوں کا بہت بڑا دانشور اور عالم و فاضل انسان تھا۔احبار، حبر کی جمع ہے۔جس طرح مسیحی اپنے مذہبی راہنما اور عالم کو راہب کہتے ہیں اسی طرح یہودی اپنے مذہبی راہنما اور عالم دین کو حبر کہتے ہیں۔یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں آخری ایام میں مسلمان ہوا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اس کو بہت بڑا مقام ملا حتیٰ کہ خلفاء کا دینی مشاور اور سرکاری مفتی بن گیا۔اگر کوئی مسئلہ پوچھنے آتا تو وہ خلفاء کو نہیں بتاتے بلکہ کعب الاحبار جواب دیتا تھا اور اس کے جواب کو اسلامی تفکر کا جواب سمجھا جاتا تھا لہٰذا اس بات پر بھی کعب الاحبار کے ساتھ مشورہ کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ آیت اہلِ کتاب کے بارے میں ہے، مسلمانوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔اس لئے کہ آیت کا پہلا حصہ اہل کتاب کے بارے میں ہے اور وہ یہ ہے:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ......

اے ایمان والو! (اہلِ کتاب کے) بہت سے علماء اور راہب، لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور

انہیں راہِ خدا سے روکتے ہیں......

لیکن یہ ثابت کرنا مشکل تھا کہ آیت کا آخری حصہ بھی اہل کتاب کے بارے میں ہے۔ اس لئے کہ ''وَالَّذِیْنَ'' کے ساتھ ''وْ'' ہے اور ''وْ'' کا ہونا دلیل ہے کہ یہ دو گروہ ہیں۔ پہلے اہل کتاب کا ذکر ہے اور پھر ''وَالَّذِیْنَ'' کے بعد جن کا تذکرہ آیا ہے وہ اور گروہ ہے جس میں سب شامل ہیں۔ پوری آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ اہل کتاب جو حرام کھاتے ہیں اور وہ لوگ جو سونا اور چاندی کا ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں ان سب کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو لیکن اگر ''وَالَّذِیْنَ'' سے واو کو ہٹا لیں تو مفہوم یہ بنتا ہے کہ اہل کتاب جو حرام کھا کر سونا اور چاندی کی ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

یہی مشورہ دیا گیا کہ اگر اس آیت سے ''وْ'' کو ہٹا دیں، یہ ایک حرف نکال دیں تو سرمایہ داروں کے عیش ہو جائیں گے اور پھر ابوذرؓ اس آیت کا نعرہ بلند نہیں کر سکے گا۔ یہ اسی شخص کا مشورہ تھا۔ وہ بھی عین اس وقت کہ جب قرآن تدوین کرنے والی کمیٹی قرآن تدوین کر رہی تھی۔ اس کمیٹی سے یہ کہا گیا کہ یہ حرف ''وْ'' کو یہاں نہیں ہونا چاہیئے۔ کمیٹی والوں نے شہادت طلب کی کہ آیا اس آیت میں ''وْ'' ہے یا نہیں؟ تو اسی کعب الاحبار نے آکر شہادت دی کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ آیت سنی تو اس میں ''وْ'' موجود نہیں تھا۔

ملاحظہ کریں کہ کس طرح دیانت کی ریشہ کنی و بیخ کنی کی گئی اور لوگوں کو دین سے نکالنے کے لئے کیا چارہ جوئی کی گئی؟! ابوذرؓ نے جب یہ دیکھا تو وہاں سے اونٹ کی ہڈی اٹھا کر اس کے سر پر ماری اور زور سے یہ بھی کہا کہ یہودی زادے تم یہودی مذہب کو تباہ کر کے اب اسلام کو تباہ کرنے آئے ہو۔ پھر تلوار نکالی اور کہا کہ اب کس کی جرأت ہے کہ جو اس آیت سے ''وْ'' کو نکالے؟

......مسیحیت کا قرآنی تعارف

مسیحیت کے اندر جب سے تحریف کا عنصر وجود میں آیا تو اس نے مسیحیت کا چہرہ ہی بگاڑ دیا۔ آج مسیحیت کے نام سے یورپ یا مسیحی مراکز میں جو مسیحی افکار پیش کئے جاتے ہیں ان کا حقیقی مسیحیت سے دور کا

بھی واسطہ نہیں ہے۔ حقیقی مسیحیت وہی ہے جس کی قرآن کریم نے نشاندہی کی ہے اور یہ قرآنی مسیحیت موجودہ محرفہ شدہ مسیحیت سے بہت ہی مختلف ہے۔

قرآن کریم کی دو اہم صفتیں مصدق اور مبشر ہونا ہیں البتہ یہ دو صفتیں تمام انبیاءؑ میں بھی موجود تھیں۔ ہر نبی جس زمانے میں بھی مبعوث ہوتا تو اپنے سے پہلے نبی کی تمام تعلیمات کی تصدیق کرتا اور آئندہ آنے والے نبی کی بشارت دیتا کہ میرے بعد دوسرا نبی آئے گا اور وہ آپ کو اسی ہدایت کا اگلا سلسلہ بیان کرے گا۔ یہ ایک خصلتِ انبیاءؑ ہے جو ہمیں اس وقت وارثانِ انبیاءؑ میں بہت کم نظر آتی ہے۔ ان نسلوں میں جو تابع و پیروانِ ادیان ہیں اور خصوصاً علماء ادیان میں یہ صفت بہت کم نظر آتی ہے کہ ہر آنے والا اپنے سے پہلے کی تائید و تصدیق کرے اور بعد والے کی بشارت سنائے کہ وہ میرے بعد آ کر اسی سلسلہ تعلیم کو جاری رکھے گا۔

لہٰذا خداوند کریم نے نبی اکرم ﷺ اور قرآن کریم کی سب سے بڑی خصوصیت یہی بیان کی ہے کہ یہ نبی بھی مصدق ہے اور یہ کتاب بھی مصدق ہے۔ یعنی جو کچھ سابقہ انبیاءؑ نے بیان کیا یہ سب کی تائید و تصدیق کرنے والے ہیں البتہ ہمارے نبی کریم ﷺ چونکہ خاتم النبیین ہیں اس لئے اس حوالے سے بشارت کی گنجائش ہی نہیں رہی ہے لہٰذا سابقہ تمام انبیاءؑ مصدق بھی تھے اور مبشر بھی لیکن ہمارے نبی ان کی نسبت مصدق ہیں البتہ نبوت کے علاوہ بہت ساری چیزوں کی بشارت بھی دے دی۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں جو کچھ سابقہ ادیان میں تھا وہ آنے والے ادیان کی جانب سے موردِ تائید واقع ہوا ہے اور جو نبی دین لے کر آیا ہے وہ سابقہ انبیاءؑ کی بشارت تھی چونکہ یوں نہیں ہے کہ ہر نبی نے اپنی فکر سے دین بنایا ہو کہ ہر نبی کا دین دوسرے نبی سے جدا ہو بلکہ جو کچھ انبیاءؑ لے کر آئے ہیں ان سب کا منبع اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ اب مصلحت کے تحت ہر امت اور ہر دور کے لئے ایک الگ شریعت کا اہتمام کیا گیا البتہ تعدد شرایع کا اپنا ایک فلسفہ بھی ہے جو اپنی جگہ پر بیان ہو جائے گا۔ اس نکتہ کے پیش نظر اس وقت ادیان شناسی کے لئے بہترین منبع قرآنِ کریم ہے۔

اس تمہید سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ہم مسیحیت کی اصلی شکل دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ یہی ہے جو قرآنِ

کریم متعارف کروا رہا ہے جسے قرآن نے وضاحت کے ساتھ اور بعض جگہ نام لے کر پیش کیا ہے لہٰذا نہ صرف اسلام کا اصلی منبع یعنی قرآن خود ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہے بلکہ مسیحیت بھی اگر قرآن سے لی جائے تو وہ بھی تحریف سے محفوظ رہے گی۔ اگر مسیحیت شناسی کے لئے قرآن کریم کو منبع قرار دیں تو جو مسیحیت سامنے آئے گی وہ ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہوگی اور اس مسیحیت میں سکیولرازم کی پیدائش کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

نمونہ کے طور پر ایک آیت کہ جس کے اندر حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کا تذکرہ ہے ذکر کرتے ہیں۔ اس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کہاں اور یہ موجودہ مسیحیت کہاں؟

وہ آیت یہ ہے:

فَلَمَّآ أَحَسَّ عِيسٰى مِنۡهُمُ الۡكُفۡرَ قَالَ مَنۡ أَنۡصَارِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الۡحَوَارِيُّوۡنَ نَحۡنُ أَنۡصَارُ اللّٰهِ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشۡهَدۡ بِأَنَّا مُسۡلِمُوۡنَo......[1]

جب عیسیٰؑ نے محسوس کیا کہ وہ لوگ کفر اختیار کر رہے ہیں تو بولے: اللہ کی راہ میں کون میرا مددگار ہوگا؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور آپ گواہ رہیں کہ ہم فرمانبردار ہیں۔

جب حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے زمانے، معاشرے اور سماج میں کفر کو محسوس کیا تو فوراً کفر کے خلاف استغاثہ بلند کیا اور اپنے حواریوں کو مدد کیلئے بلایا۔

............حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام اور احساسِ کفر

یہ بہت عمدہ اور دلچسپ نکتہ ہے جو قرآن کریم نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں پیش کیا ہے کہ حضرتِ مسیح علیہ السلام نے جب کفر کا احساس کیا۔ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے میں کفر اتنا بڑھا کہ قابل حس اور

---

[1]......(سورۂ آلِ عمران/۵۲)

قابل لمس حد تک سامنے آ گیا۔ جب کفر محسوس ہونے لگے تو پھر انسان کا فریضہ کیا ہے؟ انبیاء علیہم السلام کی سیرت کیا ہے؟ حضرت مسیح علیہ السلام بے حس نبی تو نہیں تھے لیکن موجودہ مسیحیت بے حسی کا درس دیتی ہے۔ اگر کوئی ظالم اور ستمگر آپ کے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو کیا آپ بایاں گال خود اس کے آگے کر دیں گے؟! اگر وہ آپ کا آدھا سرمایہ لے اڑے تو کیا آپ باقی آدھا حصہ خود اس کو دے دیں گے؟ اگر وہ آپ کا دایاں ہاتھ کاٹ دیتا ہے تو کیا آپ بایاں ہاتھ خود آگے کر دیں گے؟ اگر وہ آپ سے آدھی سرزمین مانگتا ہے تو کیا پوری اسے دے دو گے؟ انحرافی مسیحیت یہ ہے یعنی بے حس ہو جاؤ، سنی ان سنی کر دو جیسے فارسی میں ضرب المثل ہے ''شتر دیدی؟ ندیدی''۔

آج کل کی مسیحیت کا نعرہ اور شعار یہ ہے یعنی دیکھے کو ان دیکھا کرو، سنے کو ان سنا کرو۔ پوری زندگی ایسے بے حس بن جاؤ جیسے تم نے انجکشن لگوا لیا ہو۔ بے ہوشی کا انجیکشن لگوانے کے بعد انسان نہ کچھ دیکھتا ہے، نہ سنتا ہے اور نہ ہی کچھ محسوس کرتا ہے حتیٰ کہ سخت سے سخت درد کو بھی محسوس نہیں کرتا۔

لیکن قرآن کریم جس مسیح کا تعارف کرواتا ہے وہ یہ ہے:

فَلَمَّآ أَحَسَّ عِيسٰى مِنۡهُمُ الۡكُفۡرَ......

عیسیٰ ؑ نے احساس کیا۔ یعنی بے حس نبی نہیں تھے بلکہ بہت باحس نبی تھے۔

..............احساس کی حس

انسان کی حس بہت سی چیزوں کو محسوس کرتی ہے مثلاً کہیں کھانا پک رہا ہو تو ہم اس کی خوشبو محسوس کر رہے ہوتے ہیں حتیٰ کہ کسی گلی سے گزرتے ہوئے بھی پتا چل جاتا ہے کہ آج یہاں کیا کھانا پک رہا ہے یا کسی نالے میں بدبو ہو تو ہمیں احساس ہوتا ہے لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان بدبو کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کا گھر گندی ندی کے پاس ہو تو اسے بدبو سے اتنی اذیت نہیں ہوتی جتنی دوسرے انسان کو ہوتی ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک خاتون کی ایک چمار سے شادی ہوئی۔ جب وہ چمڑا رگڑنے والے کے گھر گئی تو

اس کو بہت اذیت ہوئی اس لئے کہ چمڑے میں بو ہوتی ہے۔ پہلے دن جب وہ اس کے گھر آئی تو اسے بہت بدبو محسوس ہوئی۔ اسے نیند بھی نہیں آتی تھی اور ناک کو ڈھانپ کر کے گھر میں چلتی پھرتی تھی۔ اب بے چارہ دباغ و چمار کیا کرتا، یہ اس کا کاروبار تھا اور بدبو بھی ختم نہیں کر سکتا تھا لیکن ہوا یوں کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اسے بدبو محسوس نہیں ہوئی تو ایک دن سارے خاندان والوں کو جمع کیا اور کہنے لگی دیکھو کہ جب سے میں اس گھر میں آئی ہوں آپ کے گھر سے بدبو ختم ہوگئی ہے!

حالانکہ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ بدبو تو موجود تھی لیکن اب اس کا احساس ختم ہوگیا تھا۔ وہ خاتون بھی ان کی طرح بو کے ساتھ خوگر ہوگئی تھی لہٰذا جب انسان خوگر ہو جائے تو پھر اسے بو محسوس نہیں ہوتی اور حس جواب دے جاتی ہے۔ پھر اس انسان کو معاشرے میں پھیلے ہوئے فسادات ،قباحتوں اور کفر کا احساس تک نہیں ہو پاتا۔

احساس کی حس

لیکن حضرت مسیح علیہ السلام کی حس نے کفر کو محسوس کیا اور یہ بہت بڑی حس ہے۔ یہ الٰہی اور انسانی حس ہے جس سے کفر اور نفاق کو حس کیا جاتا ہے۔ گندے نالے کی بدبو سب کو محسوس ہو جاتی ہے لیکن معاشرے میں کفر، شرک، الحادی نظریات، کافرانہ اور مشرکانہ افکار، ضد انسانی اور ضد دینی افکار کو محسوس کر لینا ہر حس کا کام نہیں بلکہ بیدار انسان کا کام ہے۔ یہ اس انسان کا کام ہے جس میں فطری حس زندہ ہو لیکن جو بے ہوش و مدہوش ہو اور جس نے بے حسی کا ٹیکہ لگوایا ہو اسے ایسی چیزیں محسوس نہیں ہوتیں لہٰذا انبیاء علیہم السلام نے آ کر انسانوں کو بیدار و ہوشیار کیا اور غفلت کی گہری نیند سے جھنجوڑا کہ اپنے حواس بحال رکھو۔ آپ کو محسوس ہونا چاہیئے کہ آپ کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ سیاست باقاعدہ محسوس ہونی چاہیئے، اپنے زمانے میں ہونے والے اقدامات محسوس ہونے چاہئیں اور ان کے پیچھے کارفرما حکمتِ عملی محسوس ہونی چاہیئے ورنہ ''شتر دیدی ؟ ندیدی''والی زندگی انسانی زندگی نہیں ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی سیرت نہیں ہے۔

............ظلم کے خلاف حضرتِ مسیح علیہ السلام کا شعار

جب حضرت مسیح علیہ السلام نے معاشرے میں کفر کومحسوس کیا تو پھر آرام سے نہیں بیٹھے۔ یہ بڑے مجاہد نبی ہیں چنانچہ کفر محسوس کرتے ہی یہ شعار دیا:

مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ......

خدا کی راہ میں کون ہے جو میری حمایت اور نصرت کرے؟

یہ وہی شعار ہے جو ہم کربلا میں بھی سنتے ہیں۔ حضرتِ امام حسینؑ نے جب کفر کو محسوس کیا تو فوراً یہی شعار دیا:

هَلْ مِنْ نَاصِرٍ یَّنْصُرُنِیْ......[1]

ہے کوئی نصرت کرنے والا جو میری نصرت کرے......

امام حسین علیہ السلام وارثِ انبیاء ہیں۔ جیسا کہ زیارتِ وارثہ میں آیا ہے:

اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَا وَارِثَ عِیْسٰی رُوْحِ اللّٰهِ...... [2]

آپؑ وارثِ عیسیٰؑ ہیں۔ وارث کس چیز میں ہیں؟ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام نے تو کوئی جائداد نہیں چھوڑی جو عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے امام حسین علیہ السلام کو ترکہ میں ملے بلکہ جو چیز چھوڑی تھی وہ یہی احساس تھا کہ جب معاشرے میں کفر وشرک اور سکیولرازم آجائے تو اس کے لئے ایک مخصوص بیدار حس کی ضرورت ہے تاکہ وہ محسوس کرے کہ کیا ہورہا ہے۔ جب تک وہ حس بیدار نہ ہو معاشرے میں کفر، لادینیت اور سکیولرازم محسوس نہیں ہوتا بلکہ خوگر انسان خوش ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ہمارے آنے سے بو ختم ہوگئی ہے۔

---

[1]......(ذریعة النجاة - میرزا رفیع گرمرودیؒ، صفحه ۱۲۹)(تاریخ النیاحة علی الامام الشهید الحسین بن علی علیهما السلام-السید صالح بن ابراهیم بن صالح الشهرستانیؒ)

[2]......(مفاتیح الجنان، زیارتِ وارثه)

ظلم کے خلاف حضرتِ مسیح علیہ السلام کا شعار

لہٰذا جب حضرت مسیح علیہ السلام نے کفر کے خلاف استغاثہ بلند کیا تو حواریوں نے کہا:

نَحۡنُ أَنۡصَارُ اللّٰهِ......

ہم ہیں جو خدا کی راہ میں آپ کی مدد کریں گے۔

قرآن نے مسیحیت کی یہ تصویر پیش کی ہے لیکن اگر انجیل میں دیکھیں کہ مسیحؑ اور حواری کون ہیں تو کچھ اور ہی نقشہ ملتا ہے۔ انجیل میں آیا ہے کہ حواریوں نے حضرت مسیح علیہ السلام سے کہا: آپ اجازت دیں تو ہم قیصر کے خلاف شمشیر اٹھائیں کیونکہ وہ ظالم و ستمگر ہے تو عیسیٰؑ نے جواب دیا: نہیں شمشیر نہیں اٹھانا، اس لئے کہ جو شمشیر اٹھاتا ہے وہ شمشیر سے قتل ہو جاتا ہے۔ تحریف شدہ انجیل پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ حواری حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ ہوشیار، عقلمند اور با احساس تھے، ان کی حس زیادہ کام کرتی تھی اور اپنے معاشرے و ماحول کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ ادراک رکھتے تھے۔ اس لئے تو آ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہتے ہیں کہ ہمیں شمشیر اٹھانے کی اجازت دے دیں۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو جگایا اور احساس دلایا۔ ان کو بتایا کہ اب کفر آ گیا ہے لہٰذا تم نے میرا ساتھ دینا ہے۔ پس دیکھیں کہ اصل مطلب کو کہاں سے کہاں تک لے جایا گیا؟ حقیقت کو افسانہ کیسے بنایا گیا؟ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ مسیحیت تحریف کا شکار ہوئی اور انجیل میں تصرفِ بشری کیا گیا۔ اب بھی اگر مسیحی، مسیحیت شناسی کے لئے قرآن کی طرف رجوع کریں تو انہیں حقیقی مسیحیت مل جائے گی کیونکہ قرآن تحریف سے محفوظ ہے۔

قرآنِ کریم میں وہ انحرافات ہرگز نہیں ہیں جو انجیلِ مقدس میں یہودیوں اور مسیحیوں کے ہاتھوں پیدا کئے گئے۔ یہی انحرافات سکیولرازم کے اسباب بنے۔ اگر مسیحیت میں تحریف نہ ہوتی تو سکیولرازم کی پیدائش کے لئے زمینہ سازی نہ ہوتی۔

پس سکیولرازم کی پیدائش کے اسباب میں ایک اہم عنصر تحریف ہے۔ قرآن تحریف سے محفوظ ہے لہٰذا اس سبب کے اعتبار سے اسلام میں سکیولرازم کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

2- دنیا گریزی

مسیحیت کی جو تصویر قرآن نے پیش کی ہے اس کے مطابق مسیحیت ایک اجتماعی دین ہے۔ یہ ایسا دین ہے جس میں اپنے زمانے کے لئے حیاتِ بشری کے تمام شعبوں کے تقاضے پورے تھے لیکن جب سے اس دین میں دستِ بشر کی رسائی ہوئی اور اس نے اس میں تحریف کی تو نتیجتاً اس دین کی اجتماعی شکل کو بگاڑ دیا گیا۔ اس دین سے وہ امور حذف کر دیئے گئے جو ایک جامع دین کی خصوصیت ہوتے ہیں لٰہذا ابتداء ہی سے دین کو انفرادی زندگی کا لائحہ عمل دینے کی کوشش کی گئی کہ انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے اس کے پاس کوئی جواب اور برنامہ موجود نہیں ہے۔

انجیل کے چار موجودہ نسخوں میں بہت سی آیات ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ جب لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام سے کہا کہ آپ سیاست میں مداخلت کریں، حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لے لیں، جنگ، جہاد اور دفاع کے لئے انتظام کریں تو حضرت مسیح علیہ السلام نے گویا سختی کے ساتھ اپنی امت کو روکا اور منع کیا کہ یہ امور رہنے دیں، ان میں مداخلت کرنا تمہارے لئے جائز نہیں ہے۔

حتیٰ کہ زندگی سے دوری اور دنیا گریزی اس قدر اس دین کا محور قرار پائی کہ حضرت مسیح علیہ السلام سے یہ معروف جملہ نقل کیا گیا کہ ''قیصر کا حق قیصر کو دو اور خدا کا حق خدا کو دو''۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خدا کا حق قیصر کو اور قیصر کا حق خدا کو دے ڈالو۔

یہ تفکرات وافکار باعث بنے کہ آہستہ آہستہ سکیولرازم کے لئے میدان فراہم ہو جائے۔ ظاہری بات ہے کہ جب ایک دین دنیا گریز ہو اور زندگی سے لاتعلقی کا درس دیتا ہو تو خوانخواہ ایک دن اس نتیجے پر جا پہنچے گا کہ جب یہ دین خود ہی عملی زندگی سے باہر جانے کے لئے متمائل ہے اسے اٹھا کر زندگی سے باہر کر دیا جائے۔

جو دین صرف رہبانیت، خانقاہیت، گوشہ نشینی، انفرادیت، ترکِ دنیا، ترکِ زندگی اور ترکِ معیشت کا درس دیتا ہے کہ طہارتِ روح اور تزکیہ نفس کے بہانے ایک جگہ پر بیٹھ جائیں تو لوگ بھی اس دین سے لاتعلق ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ یہ خود بھی ایک قسم کی لاتعلقی کا درس دیتا ہے۔ مسیحیت کے اندر ایسی تحریفات

ایجاد کی گئیں جن کا حتمی نتیجہ سکیولرازم کا وجود میں آنا تھا۔

اس سلسلہ میں ہر کام عمداً کیا گیا اور دین کی جامعیت کو ختم کر کے اسے یک بُعدی بنایا گیا۔ یعنی مسیحیت کے اندر زندگی کے تمام ابعاد اور پہلوؤں کا خاتمہ کر کے اس میں صرف ایک ہی پہلو چھوڑا گیا کہ انسان دنیا سے لاتعلق ہو کر رہبانیت اختیار کرے اور معنویت کے حصول کے بہانے باطن پسند بن جائے۔ اسے ایک ایسا دین قرار دیا گیا کہ جو کہتا ہے کہ اگر تمہیں قربِ خدا یا پاکیزہ زندگی چاہئے تو تم دوسروں سے ناتے کاٹ لو حتیٰ کہ زندگی کے ضروری ترین طبعی تقاضوں کو بھی ترک کر دو لہٰذا مسیحیت کے اندر بہترین متدین انسان وہ ہے جو شادی نہ کرے۔ اس لئے ان کے پادری، پاپ یا کلیسا کا پورا عملہ شادی کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ جو دین انسان کو طبیعت وفطرت سے دور کرتا ہو اور طبعی وفطری تقاضوں کو پورا کرنے کی اجازت بھی نہ دیتا ہو تو وہ بہت ساری قباحتوں اور مفاسدِ اجتماعی کے ساتھ ساتھ سکیولرازم کا منبع بن جاتا ہے۔

......اسلام دینِ معاشرت

اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر جامعیت ہے۔ اسلام کے پاس ہر شعبۂ زندگی کیلئے دستور، پیغام اور برنامہ موجود ہے لہٰذا ان دو دینوں کو ایک جیسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ وہ دین جو زندگی گریز ہے اور وہ دین جو زندگی وحیات کی رغبت دلاتا ہے ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جو دین اجتماعیت سے دور کر کے محض انفرادیت کی طرف لے جاتا ہے وہ دین کہاں اور جس میں روح اساسی اجتماعیت ومعاشرت ہے وہ دین کہاں!

پس دین کے ساتھ مسیحی طرزِ تفکر کے ارتباط اور اسلامی طرزِ تفکر کے ارتباط میں بڑا فرق ہے۔ لوگ مسیحی دین سے مے گساری کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جس طرح میخانہ میں شراب پی کر انسان گزشتہ سارے غم بھول جاتا ہے اور تھوڑا سا سکون آ جاتا ہے یہ دین سے یہی فائدہ اٹھاتے ہیں کہ کلیسا میں آ کر تھوڑا سا سکون مل جائے۔

جبکہ اسلام اس طرزِ تفکر کی سخت مخالفت کرتا ہے بلکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ جس کے اندر اجتماعیت اور جامعیت نہ ہو اسے دین نہیں کہا جاتا۔ مسیحیت کہتی ہے کہ جو راہب اور تارکِ دنیا نہ ہو وہ صحیح مسیحی نہیں جبکہ اسلام نے کہا ہے کہ جو رہبانیت اختیار کرے اور اجتماعی تفکر نہ رکھتا ہو وہ مسلمان ہی نہیں۔

حدیثِ نبویؐ ہے:

مَنْ اَصْبَحَ لَا یَهْتَمُّ بِاُمُوْرِ الْمُسْلِمِیْنَ فَلَیْسَ بِمُسْلِمٍ......[1]

یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فتویٰ ہے کہ جو انسان ایسے عالم میں صبح کرے کہ اُمورِ مسلمین کا اہتمام نہ کرے، ان کو اہمیت نہ دے، ان کی طرف توجہ نہ کرے، ان کے لئے کوئی اقدام نہ کرے، ان کے لئے کوئی سوچ اور تفکر نہ رکھتا ہو تو ایسا انسان دائرہ اسلام سے خارج ہے مثلاً ہزارہ قوم اپنا ایک شجرۂ نسب اور خاندانی سلسلہ رکھتی ہے لہٰذا ہر آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں بھی ہزارہ قوم میں سے ہوں بلکہ جو بھی ہزارہ خاندانی سلسلہ اور شجرہ نسب سے منسلک ہو وہی کہہ سکتا ہے کہ میں ہزارہ ہوں۔ پس ہزارہ قوم میں شمولیت کے لئے ایک معیار ہے اور اس معیار کے گرد دائرہ ہے کہ جو بھی اس دائرہ کے اندر ہے وہ ہزارہ ہے اور جو اس دائرہ معیار سے باہر ہے وہ ہزارہ نہیں ہے چاہے کتنے ہی دعوے کرے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسلام میں شمولیت کے لئے دائرہ کھینچ دیا کہ جو بھی امور مسلمین کو روزانہ اور ہمیشہ اہمیت نہ دیتا ہو وہ دائرہ اسلام سے باہر ہے۔ اب کوئی ہزار کہتا رہے کہ میں مسلمان ہوں لیکن خود بانی اسلام ہیں کہ تم مسلمان نہیں ہو! مثلاً پاکستانی کورٹ کہے کہ آپ پاکستانی نہیں ہیں لیکن میں زور زور سے کہوں میں پاکستانی ہوں تو یہ نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ اتھارٹی کہہ رہی ہے۔ یہاں بھی اتھارٹی کہہ رہی ہے کہ تم مسلمان نہیں ہو، بے شک نمازیں اور تمام رسوماتِ مذہبی انجام دیتے رہو، بے شک کہتے رہو کہ میں نے اتنا زہد اختیار کیا ہوا ہے، اتنے روزے رکھے ہیں لیکن جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے رکھو گے تو وہ فرمائیں گے کہ یہ تو

---

[1]......(الکافي-الکلینیؒ، باب ا لاهتمام بامور المسلمين والنصيحة لهم ونفعهم، الجزء۲، صفحه ۲۳۵)

اسلام نہیں ہے، اس میں تو اجتماعیت نہیں ہے، اس میں امور مسلمین کا اہتمام کہیں نظر نہیں آ رہا۔

لہٰذا اس دین کا مقایسہ مسیحیت سے کریں کہ جو کہتا ہے کہ تم صبح کرو لیکن اگر کسی دوسرے کے امر میں دلچسپی لی تو تم مسیحی نہیں ہو، بس اپنے آپ کو سنبھالو حتیٰ کہ اپنی زوجہ سے بھی کوئی سروکار نہ رکھو کہ وہ کیا کرتی ہے، اپنے بچوں کو بھی چھوڑ دو، بس اپنی طہارت، پاکیزگی اور تہذیب نفس کا خیال رکھو بلکہ ایسا دین جو خاندان تشکیل دینے سے نفرت دلاتا ہے یہ دین اسلام کے ساتھ اصلاً قابل مقایسہ ہی نہیں ہے۔

اسلام تو یہاں تک کہتا ہے:

اَلنِّکَاحُ سُنَّتِیُ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیُ فَلَیُسَ مِنِّیُ......۱

ترجمہ: نکاح میری سنت ہے اور جو میری سنت سے منہ موڑے گا پس وہ مجھ سے نہیں ہے......

جو نکاح سے بیزار ہو، جو شادی کرنے سے متنفر ہو وہ مسلمان ہی نہیں ہے اس لئے کہ نکاح سے بیزاری اور ازدواجی زندگی سے فرار وہی رہبانیت ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

لَا رُهُبَانِیَّةَ فِی الُاِسُلَامِ......۲

اسلام میں رہبانیت کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی اس طرح گزاری ہے کہ جس میں رہبانیت کا شائبہ تک نہیں ہے بلکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے افراد کی مذمت کی اور سختی سے ڈانٹا کہ جو زندگی چھوڑ کر کسی جنگل، خانقاہ یا صحرا میں خیمہ لگا کر عبادت میں مشغول ہو گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کئی شادیاں تھیں۔ بہت سی معاشرتی

۱......(بحار الأنوار-الشیخ محمد باقر المجلسیؒ،الجزء۱۰۰،صفحه ۲۲۰)

۲......(الخصال-للشیخ الجلیل الاقدم الصدوق أبی جعفر محمد بن علی بن الحسین بن بابویه القمیؒ،المتوفی:۳۸۱ھ،الجزء۱،صفحه۱۴۵)

ذمہ داریوں کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زندگی کو ترک نہیں کیا۔ کیا یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی زیادہ بڑے مسلمان ہو گئے تھے جیسے کہتے ہیں پاپ سے بڑا کیتھولک ہونا یا جس طرح ایران میں کسی زمانے میں تند مزاج کو کہا جاتا تھا کہ فلاں شخص امام خمینیؒ سے بھی زیادہ انقلابی ہے، آخر امام خمینیؒ سے بڑا انقلابی تو کوئی نہیں ہوسکتا لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ متدین بھی کوئی نہیں ہوسکتا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رہبانیت کو اختیار نہیں کیا تو کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ رہبانیت اختیار کرے۔

حضرت امام علی علیہ السلام اپنے کسی صحابیؓ کے پاس تشریف لے گئے تو اس نے اپنے بھائی عاصم بن زیاد کے بارے میں آپ سے شکایت کی کہ وہ گھر بار اور بیوی بچے وغیرہ چھوڑ کر فقط عبادت میں مشغول ہو گیا ہے، اس نے بالوں کی چادر اوڑھ لی ہے اور دنیا سے بالکل بے لگاؤ ہے تو حضرت علی علیہ السلام نے اس شخص کو فوراً بلوایا اور وہ ڈانٹ پلائی کہ اس کے بعد اس کو رہبانیت کا خیال بھی نہ آیا۔ نہج البلاغہ میں اس شخص کے بارے میں خطبہ موجود ہے۔ [1]

اسلام ترکِ دنیا اور ترکِ معیشت کا درس نہیں دیتا البتہ یہاں دنیا سے مراد وہ مذموم دنیا نہیں ہے جو دین کے مقابلہ میں ہے بلکہ دنیا سے مراد موت سے قبل کی زندگی ہے جیسے روایات میں کہا گیا ہے:

اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ...... [2]

دنیا آخرت کی کھیتی ہے......

موت سے پہلے آخرت کی تیاری کے مرحلے کا نام دُنیا ہے لہٰذا دنیوی امور، معیشت کیلئے تلاش وکوشش اور رزقِ حلال حاصل کرنا اسلام میں عبادت قرار دیا گیا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

---

[1]......(نهج البلاغه، خطبه/ ۲۰۷)

[2]......(بحار الأنوار- الشيخ محمد باقر المجلسیؒ، الجزء ٦٧، صفحه ۲۲۵)(عوالی اللآلی-ابن ابی جمهور احسائی، الجزء، ۱، صفحه ۲٦۷)

اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ......[1]

(حلال) روزی کمانے والا حبیبِ خدا ہے......

اسلام یہ نہیں کہتا کہ انسان اللہ پر توکل کے بہانے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر بیٹھ جائے اور حصولِ رزقِ حلال کی راہ میں محنت و مشقت سے ہاتھ اٹھالے۔ مولانا رومؒ نے اپنے کلام میں اس کی نہایت خوبصورت ترجمانی کی ہے:

رمز الکاسب حبیب اللّٰہ شنو
از توکّل در سبب کاھل مشو

رو توکّل کن تو با کسب ای عمو
جھد میکن ، کسب میکن مو بمو

جھد کن جدّی نما تا وارھی
ورتو از جھدش بمانی ابلھی......[2]

محنت کرنے اللہ کا حبیب ہے، سنو! اس کا راز کیا ہے،
صرف توکل کر کے کاہل وسست نہ بنو،
اے بھائی! جاؤ اور توکل کرو لیکن کسبِ معاش کے ساتھ،
دقیق اور چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی جدو جہد وکوشش کرو، کسب (بھی) کرو،
جدو جہد وکوشش سنجیدگی سے کرو تا کہ آزاد ہو جاؤ،
ورنہ اگر جدو جہد اور کوشش سے رکے تو یہ سب سے بڑی جہالت ہوگی!

---

[1]......(اسرار نماز- مرحوم ملا محسن فیض کاشانیؒ)

[2]......(مثنوی معنوی- مولانا رومؒ، داستان" نخجیران و بیان توکّل و ترک جھد کردن"، دفتر اول، صفحہ ۲۱)

............اسلام میں عرفان کا تصور

اسلام میں سکیولرازم کی پیدائش کے لئے جو مصنوعی حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہی عرفان اور تصوف ہے۔ یہ وہی اسرائیلیات و رہبانیت ہے جو عرفان اور تصوف کے نام پر اسلام میں داخل ہوئی ہے۔ عرفان، تصوف، ترکِ دنیا، گوشہ نشینی جیسے تمام مفاہیم اسرائیلیات ہیں جنہیں مصنوعی طور پر اسلام میں بھی داخل کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔

البتہ اسلام میں عرفان کا صحیح تصور بھی موجود ہے کہ جس طرح زہد کا ایک صحیح اور ایک غلط تصور ہے۔ اسلام صحیح زہد کی ترغیب دلاتا ہے۔ زہد یعنی دنیا سے محبت نہ کرنا اور دنیا کو اصلی غرض نہ سمجھنا۔ زہد کی سب سے بہتر تعریف وہی ہے جو امیر المومنین علیہ السلام نے کی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

اَلزُّهْدُ كُلُّهُ بَيْنَ كَلِمَتَيْنِ مِنَ الْقُرْاٰنِ: قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ "لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتَاكُمْ"[1] وَ مَنْ لَّمْ يَأْسَ عَلَى الْمَاضِيْ وَ لَمْ يَفْرَحْ بِالْاٰتِيْ فَقَدْ أَخَذَ الزُّهْدَ بِطَرَفَيْهِ...... [2]

(زہد کی مکمل تعریف قرآن کے دو جملوں میں ہے) ارشادِ الٰہی ہے: ''جو چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے اس پر رنج نہ کرو اور جو چیز خدا تمہیں دے اس پر اتراؤ نہیں'' لہٰذا جو شخص جانے والی چیز پر افسوس نہیں کرتا اور آنے والی چیز پر اتراتا نہیں اس نے زہد کو دونوں سمتوں سے سمیٹ لیا......

اسی طرح اسلام کے اندر عرفان کا بھی صحیح تصور ہے۔ صحیح عرفان وہی ہے جو قرآن نے بتایا ہے یعنی معرفت خدا تبارک وتعالیٰ۔ جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

أَوَّلُ الدِّيْنِ مَعْرِفَتُهُ...... [3]

یعنی معرفتِ الٰہی دین کی اساس ہے۔

---

[1]......(سورۃ الحدید/۲۳)
[2]......(نہج البلاغہ، حکمت/۴۳۹)
[3]......(نہج البلاغہ، خطبہ/۱)

یہی صحیح عرفان ہےلہذا معرفت الٰہی کے لئے جس طرح انفرادی عرفان ہے اسی طرح اجتماعی عرفان بھی ہے۔قرآن کریم نے کسی بھی جگہ یہ گنجائش ہی نہیں چھوڑی کہ انسان یہ سفر عرفانی الگ اور تن تنہا طے کرے۔انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی عارف نہیں ہوسکتا۔سب سے بڑے عرفاء انبیاء علیہم السلام ہیں لیکن انہوں نے یہ سفرِ عرفانی اپنی امتوں کے ساتھ قافلہ سالار بن کر طے کیا ہے۔انبیاء علیہم السلام نے اپنی زندگیاں کسی خانقاہ میں یا دور دراز کسی جنگل میں نہیں گزاریں بلکہ معاشرے کے اندر لوگوں کے ساتھ مل جل کر گزاری ہیں۔امت کے اندر رہ کر خود بھی سفر عرفانی طے کیا اور امتوں سے بھی یہ سفر طے کروایا۔ان کے بعد جتنے اولیاء اللہ اور ائمہ علیہم السلام آئے ہیں سب نے یہ سفر اکٹھا طے کیا ہے۔

..........اسلامی تعلیمات کا خاص امتیاز

اگر چہ اسلامی تعلیمات میں اسرائیلیات داخل کرنے کی بہت کوششیں کی گئی ہیں لیکن اسلامی تعلیمات کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اگر کوئی باہر سے آکر اسلام میں اپنی فکر داخل کرنا چاہے تو دور سے پہچانا جاتا ہے مثلاً ہزارہ قوم کے لوگوں کے چہرے کی ایک خاصیت ہے جو دوسروں کے چہروں میں نہیں ہے۔اب اگر باہر سے آنے والا ہزار کوشش بھی کرے پھر بھی دور سے پہچانا جاتا ہے کہ یہ ہزارہ نہیں ہے۔اسی طرح اسلامی تعلیمات بھی ذاتی خصوصیت کی بناء پر دوسرے مذاہب کی تعلیمات سے ممتاز ہیں البتہ ہر ایک کے لئے نہیں بلکہ اس شخص کے لئے ممتاز ہیں کہ جو اسلام شناس اور روحِ اسلام سے آشنا ہو۔

ایسے نہیں ہونا چاہئے کہ جس نے جو حدیث سنائی اسے اسلام سمجھ کر اس کے پیچھے چل پڑیں۔یوں اسلام شناسی نہیں ہوتی بلکہ پہلے روحِ اسلام سے آشنا ہوں پھر تعلیمات کی پہچان مشکل نہیں ہے۔مثلاً یہ حدیث حضرت امام حسین علیہ السلام سے منسوب ہے کہ **انما الحیاة عقیدة و جهاد**.یہ کسی دور میں ہمارے جوانوں کا نعرہ بھی رہا ہے کہ ''حسینیوں کی زندگی عقیدہ و جہاد ہے''، یعنی زندگی عقیدہ اور جہاد کا نام ہے۔حضرت شہید مرتضیٰ مطہریؒ فرماتے ہیں کہ میں چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی شخص مجھے یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ حدیث امام حسین علیہ السلام کی ہے، میں

چیلنج کر کے کہتا ہوں کہ کوئی اس حدیث کی سند نہیں بتا سکتا۔ یہ ہرگز امام حسین علیہ السلام کی حدیث نہیں ہے۔

دلیل یہ ہے کہ یہ حدیث روحِ حسینیت و روحِ اسلام کے خلاف ہے البتہ اس اعتبار سے نہیں کہ اسلام میں جہاد یا عقیدہ نہیں ہے۔ دونوں اسلام میں ہیں لیکن یوں نہیں کہ جو بھی اپنے عقیدے کی راہ میں جہاد کرتا ہے، یہی زندگی ہے۔ عقیدے کا دفاع کرنا زندگی نہیں ہے، اس لئے کہ ہر انسان اپنے عقیدے کا دفاع کرتا ہے، حتیٰ ملحد بھی اپنے عقیدے کی راہ میں قربانی پیش کرتا ہے اور اس کا دفاع کرتا ہے۔ ہر شخص ایسا ہے جو اپنے عقیدے کی راہ میں لڑنے کے لئے تیار ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو بھی عقیدہ ہو اس کا دفاع کیا جائے اور یہی فلسفۂ زندگی بھی ہے، ہرگز ایسا نہیں ہے۔ بلکہ عقیدہ حق بھی ہو سکتا ہے اور باطل بھی۔ بہت سے لوگ ہیں جن کے عقائد باطل ہیں اور وہ سختی سے ان کا دفاع بھی کرتے ہیں۔

بلکہ اسلام و حسینیت کی روح یہ ہے کہ عقیدہ قرآن و سنت کے مطابق ہو، پھر اس کو عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے بیان کریں اور جہاں اس پر کوئی حملہ آور ہو تو اس کا دفاع کریں۔ یہ معیار اس وقت انسان کے ہاتھ آتا ہے جب روحِ اسلام کو سمجھ لیا ہو، ورنہ سطر بہ سطر آگے جانا، لکیر کا فقیر ہونا اسلام شناسی کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ پھر جب ایک سطر دوسری سطر سے نہیں ملتی تو انسان مشکل میں پڑ جاتا ہے۔

لیکن جو شہید مطہریؒ کی طرح روحِ اسلام سے آشنا ہو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس جملے کی سند صحیح ہے یا نہیں، وہ سند دیکھنے سے پہلے سمجھتا ہے کہ یہ معصوم کا کلام ہے یا نہیں؟ یہ اسلامی تعلیمات میں سے ہے یا نہیں؟ جو مطلب روحِ اسلام کے ساتھ سازگار نہ ہو تو وہ فوراً کہتا ہے کہ یہ اسلامی نہیں ہے، اس لئے کہ یہ روحِ اسلامی سے نہیں ملتا۔

جیسے اگر کوئی انسان روحِ کلامِ اقبال سے آشنا ہو تو وہ فوراً سمجھ جاتا ہے کہ یہ اقبالؒ کا شعر ہے یا نہیں۔ روحِ کلامِ اقبال کیا ہے؟ آزادی اور حریت کلامِ اقبال کی روح ہے۔ پس اگر کوئی ایسا شعر پڑھے جس سے بوئے غلامی آتی ہو، جس میں قومیت، نسل پرستی اور ذات پات کی ترویج ہو اور شعر پڑھنے والا کہے کہ میں نے یہ اقبالؒ کا شعر پڑھا ہے تو جو اقبالؒ شناس ہے وہ پوری قاطعیت اور پورے جزم کے ساتھ کہے گا کہ یہ

اقبالؒ کا شعر نہیں ہے۔ یہ شعر روحِ اقبالؒ کے خلاف ہے۔ اقبالؒ انسانوں کو بندوں کی بندگی سے آزاد کرانے والا شاعر ہے، نہ کہ غلامی دلانے والا لہٰذا یہ کسی غلام شاعر کا کلام ہوسکتا ہے، اقبالؒ کا کلام ہر گز نہیں ہوسکتا۔

...........عرفان اورسیاست

حضرت آیۃ اللہ جوادی آملی مدظلہ نے یہاں ایک عمدہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ ایک زمانے میں علماءِ اسلام کی مشکل یہ تھی کہ ہم شریعت کوسیاست کے ساتھ کس طرح ربط دیں، اہل شریعت، سیاست کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ اور مرتبط ہوں لیکن جب حضرت امام خمینیؒ نے دین اور سیاست کو ایک کر کے دکھایا، چونکہ حضرت امام خمینیؒ فقیہ شریعت ہونے کے ساتھ ساتھ عارف بھی تھے لہٰذا جب ایک عارف نے سیاست کی تو یہ مشکل عملاً حل ہوئی۔

یہ مشکل کیوں تھی؟ اس لئے کہ علماءِ شریعت کو سیاست سے اس قدر دور کیا گیا حتیٰ کہ ان ذہنوں میں یہ ڈالا گیا کہ دین وشریعت کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ سبق انہوں نے بیرونی مدرسین سے پڑھ کر باور کر لیا تھا۔ ان میں جزم ویقین پیدا ہوگیا تھا کہ دین اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن جب دوسری جانب دیکھتے ہیں کہ دین اور شریعت میں سیاسی احکامات بھی موجود ہیں بلکہ دین سراسر سیاست ہے تو ان کو یہ مشکل ستانے لگی کہ سیاست اور شریعت کو آپس میں کیسے مرتبط کریں؟

لامحالہ اب کسی توجیہ اور تأویل کی ضرورت ہے لہٰذا ہر ایک نے اپنے زمانے اپنے خاص طریقے سے توجیہ وتأویل کی لیکن توجیہات اور تأویلات کے باوجود ایک زمانے میں تمام فرقوں کے علماءِ اسلام کے لئے سب سے بڑی بحث یہ تھی کہ شریعت اور سیاست کا آپس میں کیا ارتباط ہے؟

شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت بھی ہے یعنی معنوی اور عرفانی راستہ۔ جن لوگوں سے شریعت سیاست سے ہم آہنگ نہیں ہورہی تو ظاہر سی بات ہے کہ ان کے نزدیک اہل طریقت تو کبھی سیاست کرنے کے مجاز نہیں ہوں گے چونکہ طریقت کی نسبت شریعت سیاست سے نزدیک تر ہے اور طریقت سیاست سے بہت

فاصلہ پر ہے۔

حضرت امام خمینیؒ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ آپ فقیہِ شریعت ہونے کے ساتھ عارفِ طریقت بھی تھے۔ آپؒ نے نہ فقط فقیہِ شریعت بن کر سیاست کی بلکہ ایک عارف کی حیثیت سے بھی سیاست کی۔ ایک فقیہِ شریعت تختِ سلطنت پر بیٹھ کر حکومت کرے یہ پھر بھی قابل تصور ہے لیکن ایک عارف وصاحبِ طریقت سیاست کرے یہ دنیا نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا لہٰذا اسلام میں عرفان کا صحیح تصور موجود ہے۔

اسلام میں جس طرح شریعت سیاست سے ہم آہنگ ہے اسی طرح عرفان وطریقت بھی سیاست سے ہم رنگ وہم آہنگ ہے۔ دونوں اجتماعی چیزیں ہیں۔ یوں نہیں کہ طریقت یا عرفان کا راستہ جنگلوں، غاروں، پہاڑوں، گھر کے گوشوں یا سردابوں میں طے ہوتا ہو بلکہ جہاں پر سیاست کی جاتی ہے وہاں پر ہی عرفانی سفر طے ہوتا ہے۔ سیاست تو محرابوں یا گھر کے گوشہ میں نہیں ہوتی بلکہ سیاست کے لئے سماج چاہیے۔ اسی طرح شریعت وطریقت کے لئے بھی سماج چاہیے۔ تینوں ایک ہی راستہ طے کرتے ہیں۔

......اسلام دینِ سیاست

اسلام دینِ سیاست ہے۔ خود دین اور تدین سیاست ہے۔ جو آدمی یہ کہتا ہے کہ میں سیاسی نہیں ہوں تو وہ دوسرے لفظوں میں کہتا ہے کہ میں بے دین ہوں۔ دین صحیح زندگی گزارنے کے ڈھنگ یعنی معاشرے کی تدبیر کا نام ہے۔ دوسرے الفاظ میں الٰہی فرامین اور دستورات وقوانین کے مطابق معاشرۂ بشری کی تدبیر کرنا دین ہے۔ سیاست بھی یہی چیز ہے چونکہ سیاست کا معنٰی بھی ''تدبیر اجتماع'' اور ''تدبیر معاشرۂ بشری'' ہے۔ یہی دیانت بھی ہے اور یہی سیاست بھی ہے۔

البتہ ہم نے دین وسیاست میں یہ فرق رکھ دیا ہے کہ یہ تدابیر اگر خدا کی جانب سے ہوں تو دیانت ہے اور اگر بشر کی جانب سے ہوں تو سیاست ہے جبکہ تدبیر معاشرہ اور تدبیر انسان فقط اللہ کی جانب سے ہے، اللہ تعالیٰ ہی تدبیر کرنے والا اور ربوبیت کا مالک ہے لہٰذا اگر تدبیر انسان اور تدبیر معاشرہ الٰہی دستورات کے

مطابق ہوتو یہی سیاست بھی ہے اور دیانت بھی ہے۔

دیانت جو خدا کی جانب سے ہے اگر اس کو معنویت وعبادات کے ساتھ مخصوص کر دیں اور باقی امور یعنی تدبیر اجتماع کے لئے انسان خود کوئی طریقہ ڈھونڈ لے تو یہاں سیاست دین سے الگ رہ جاتی ہے۔ یعنی تدبیر معاشرہ ہم خود کریں اور پھر چند لمحے نکال کر خدا کی رضا کی خاطر دو رکعت نماز بھی پڑھیں تو یہ دیانت اور سیاست کی جدائی ہے۔ اگر سیاست دین سے جدا ہو جائے تو اس کی ترجمانی مرحوم اقبالؒ نے یوں کی ہے:

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی......[1]

اگر ہم دیانت کے معنٰی میں تصرف نہ کریں تو واضح ہے کہ دیانت سے مراد اللہ تعالٰی کے احکام اور دستورات کے مطابق معاشرے اور انسان کی تدبیر کرنا ہے اور سیاست بھی تدبیر اجتماع کا نام ہے لہٰذا دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

......امام خمینیؒ کی نظر میں سیاست عینِ دیانت

حضرتِ امام خمینیؒ سے یہ جملہ نقل ہوا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ دین میں سیاست نہیں ہے، دین میں حیات کا کوئی منصوبہ نہیں ہے تو وہ اپنی بات کی طرف توجہ کرے کہ کیا کہہ رہا ہے؟! وہ تمام انبیاء علیہم السلام اور ائمہ معصومین علیہم السلام کو جھٹلا رہا ہے۔ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں سیاست نہیں تھی؟ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکومتِ اسلامی تشکیل نہیں دی؟ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں آپ کو کسی دن اجتماعیت سے ہٹ کر انفرادیت نظر آتی ہے؟ کوئی ایک دن بتائیں جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انفرادی طور پر بس اپنا خیال رکھا ہو؟ صرف اپنی نماز پڑھی ہو؟ صرف اپنے گھر میں رہ کر اپنے خاندان کا خیال رکھا ہو؟

---

[1]......(بالِ جبرئیلؑ، صفحہ ۵۰)

حضرت امام خمینیؒ نے کسی سیاسی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوکرسیاست کی ڈگری نہیں لی تھی بلکہ انہوں نے یہی فقہ اور وہی کورس پڑھا جوہم طالبِ علم مدرسوں میں پڑھتے ہیں۔ جو ہمارے ملک کے مدارس میں بھی پڑھایا جاتا ہے۔ وہی افکار، فقہ، توضیح المسائل، شرح اللمعہ، شرائع الاسلام وغیرہ کہ جوایک عالمِ دین پڑھتا ہے انہوں نے بھی پڑھیں مثلاً عروۃ الوثقیٰ پڑھ کر اس پر حاشیہ لکھا، فقہ میں تحریرالوسیلہ یاوسیلہ النجاۃ لکھی، شیعہ فقہ کی محوری کتاب جواہرالکلام جوایک سنتی اور روایتی طریقے سے لکھی گئی ہے جس طرح سے ہر فقیہ پڑھتا ہے انہوں نے بھی پڑھی۔ پھر ساری فقہ پڑھ کرآخر کار ایک نتیجہ لیا۔ کہا کہ مجھے ان لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں سیاست نہیں ہے! میں نے وضو سے لے کر دیات تک جوفقہ پڑھی ہے اس میں مجھے اسلام میں سیاست کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔ آپ بتائیں کہ سیاست کہاں نہیں ہے؟

البتہ نہ وہ سیاست جو آج رائج ہے۔ وہ خود ایک جملہ لکھتے ہیں کہ ساواک (شاہ حکومت کا خفیہ اطلاعات کا ادارہ) کا چیف میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ آپ حاجی آقا ہیں، آپ مرجع تقلید ہیں، آپ عالم دین ہیں، آپ بہت مقدس ہیں اور سیاست پدرسوختگی ہے (ایک بہت ہی ناروا چیز ہے)۔ یہ آپ کو زیب نہیں دیتی لہٰذا یہ پدرسوختگی ہمارے لئے چھوڑ دیں اور اپنا مقدس مقام محفوظ رکھیں۔ اس نے چاپلوسی کے الفاظ استعمال کئے۔

امام خمینیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو کہا تم جو سیاست کرتے ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ واقعاً پدرسوختگی ہے اور وہ تم پر جچتی ہے لیکن میری سیاست عین دین ہے، یہ پدرسوختگی نہیں بلکہ عین دیانت ہے۔

دوسرے لفظوں میں ساواک کا چیف امام خمینیؒ کو کہہ رہا تھا کہ یہ دین چھوڑ و جیسے فارسی میں کہتے ہیں: ''ھندوانہ زیر بغل گذاشتن''، کسی عالم دین کے بغل میں ہندوانہ لگادو کہ وہ دین ہی چھوڑ دے۔ اس سے کہو کہ آقا صاحب آپ تو بڑے مقدس ہیں' آپ پر یہ عمامہ اچھا نہیں لگتا تو وہ عمامہ اٹھا کے پھینک دے گا۔ یہ وہی باتیں ہیں جو آج کل کہی جارہی ہیں۔

بسا اوقات کسی کو تحقیر کر کے دور کر سکتے ہیں اور بعض اوقات کسی کی تعظیم کر کے مثلاً آپ پسند نہیں

کرتے کہ میں آپ کی کسی میٹنگ میں بیٹھوں تو اب دو طریقے ہیں کہ یا تو میری تحقیر وتوہین کروتا کہ میں خود اٹھ کر چلا جاؤں یا میری اتنی تعظیم کرو کہ مجھے چاپلوسی سے محفل سے باہر نکال دو چونکہ آپ نہیں چاہتے کہ میں آپ کی میٹنگ میں بیٹھ کر آپ کے اسرار سے آگاہ ہو جاؤں مثلاً آپ یہ کہیں کہ یہ ہم جوانوں، ہم گناہ گاروں کی میٹنگ ہے اور آپ ماشاءاللہ آغا صاحب وشاہ صاحب ہیں۔ یہ اتنی مقدس جگہ نہیں ہے۔ شاید ہمارے منہ سے کوئی ایسی بات نکلے جو آپ کو ناگوار گزرے یا آپ کے شایانِ شان نہ ہو۔ میں بھی واقعاً احساس کرنے لگوں کہ واقعی میں تو بڑا مقدس ہوں لہٰذا مجھے اس غیر مقدس جگہ نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ دیکھیں کتنی چالاکی سے آپ نے مجھے میٹنگ سے باہر نکال دیا۔ اب میری غیبت میں بیٹھ کر جو مرضی ہے کریں۔ پیچھے ہنستے بھی ہیں کہ دیکھو کتنا سادہ آدمی ہے کہ ہم نے تھوڑی سی ہوا بھری تو اٹھ کے باہر چلا گیا، آغا! آغا! کہنے سے چلا جاتا ہے۔

ساواک کا چیف بھی امام خمینیؒ کے ساتھ یہی چالاکی کرنا چاہتا تھا لیکن امام خمینیؒ تو ایک بصیر انسان تھے لہٰذا فوراً سمجھ گئے کہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ جواب دیا کہ میری سیاست عین دیانت ہے۔ ہماری پوری فقہ سیاست سے بھری پڑی ہے۔ نہ فقط ہماری ساری فقہ سیاست ہے بلکہ اہل سنت کی فقہ بھی اسی طرح ہے۔ میں اگر امامیہ فقہ کا حوالہ دے رہا ہوں تو یہ اس لئے ہے کہ میں امامیہ فقہ کا طالب علم ہوں۔ ورنہ اہل سنت کی فقہ میں جا کر دیکھیں تو وہاں پر بھی یہی مطلب موجود ہے۔

..........فقه میں احکامِ سلطانیه

فقہ کے اندر ایک پورا باب بنام ''الاحکام السلطانیہ'' ہے۔ امامیہ سے پہلے یہ مطلب اہل سنت نے فقہ کے اندر دریافت کیا اور اس کا پرچار بھی کیا بلکہ حق یہ ہے کہ علم فقہ میں اہل سنت ہم پر مقدم ہیں کیونکہ اہل سنت کے ہاں شریعت فہمی کا دروازہ جلدی بند ہو گیا اور اس کے فوراً بعد اجتہاد کا دروازہ کھلا لیکن امامیہ کے ہاں ائمہ معصومین علیہم السلام یکے بعد دیگرے آتے رہے اور ڈھائی سو سال تک بابِ شریعت کھلا رہا۔ غیبتِ کبریٰ کے زمانے تک امامیہ کو اجتہاد کی ضرورت محسوس تک نہیں ہوئی۔

لیکن اہل سنت کو آنحضرت ﷺ کی رحلت کے فوراً بعد اجتہاد کی ضرورت محسوس ہوئی لہٰذا انہوں نے بڑھ کر اجتہاد کا دروازہ کھولا لیکن افسوس کہ زیادہ دیر تک یہ سلسلہ نہیں چلا اور انہوں نے یہ دروازہ جلدی بند کر دیا۔ اس اجتہاد کے نتیجے میں وہ ہم سے پہلے اس مطلب کی طرف متوجہ ہوئے اور فقہ میں احکام سلطانیہ کا باب کھولا۔ احکام سلطانیہ سے مراد حکومت، حاکم اور ریاست عامہ کے احکام ہیں لہٰذا اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کی فقہ میں احکامِ سلطانیہ اپنے خاص فقہی انداز سے لکھے گئے ہیں۔

فقہ امامیہ میں تو بقول حضرت امام خمینیؒ سیاست کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ حج کا ہر عمل سیاسی وعبادی ہے۔ اسی طرح نمازِ جماعت، نمازِ جمعہ اور خمس وزکوٰۃ بھی سیاسی وعبادی عمل ہے۔ حضرت امام خمینیؒ نے بھی بارہا صاحبِ جواہر[1] کی تمجید وتعریف کی ہے اور وہ بھی اس لئے کہ صاحبِ جواہر ایک اسلام شناس فقیہ ومجتہد ہیں۔ ان کی اسلام شناسی کی علامت یہ ہے کہ یہی صاحبِ جواہر فرماتے ہیں:

لَوْلَا عُمُوْمُ الْوِلَايَةِ لَبَقِيَ كَثِيْرٌ مِّنَ الْاُمُوْرِ الْمُتَعَلِّقَةِ بِشِيْعَتِهِمْ مُعَطَّلَةً . فَمِنَ الْغَرِيْبِ وَسْوَسَةُ بَعْضِ النَّاسِ فِيْ ذٰلِكَ ، بَلْ كَاَنَّهُ مَا ذَاقَ مِنْ طَعْمِ الْفِقْهِ شَيْئًا ، وَلَافَهِمَ مِنْ لَحْنِ قَوْلِهِمْ وَرُمُوْزِهِمْ أَمْرًا ، وَلَاتَأَمَّلَ الْمُرَادَ مِنْ قَوْلِهِمْ اِنِّيْ جَعَلْتُهُ عَلَيْكُمْ حَاكِمًا وَقَاضِيًا وَحُجَّةً وَخَلِيْفَةً وَنَحْوَ ذٰلِكَ مِمَّا يَظْهَرُ مِنْهُ اِرَادَةُ نَظْمِ زَمَانِ الْغَيْبَةِ لِشِيْعَتِهِمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاُمُوْرِ الرَّاجِعَةِ اِلَيْهِمْ......[2]

---

[1]......(صاحبِ جواہر کا پورا نام شیخ محمد حسن نجفی ابن شیخ باقر نجفی ہے لیکن اصلی نام کے بجائے صاحبِ جواہر کے نام سے زیادہ شہرت یافتہ ہیں۔ صاحبِ جواہر تیرہویں صدی ہجری کے سب سے بڑے شیعہ عالم دین ہیں۔ ان کی علمی شخصیت تمام شیعہ علماء کیلئے مسلم اور قابل قبول ہے۔ آپؒ نے شعبان کی پہلی تاریخ ۱۲۶۶ھ کو نجف اشرف میں وفات پائی اور وہیں پر مدفون بھی ہیں۔)

[2]......(جواهر الكلام - شيخ الفقهاء وامام المحققين الشيخ محمد حسن النجفیؒ، الجزء ۲۱، صفحه ۳۶۲)

اگر فقیہ کی ولایت عمومی نہ ہو تو شیعوں سے متعلق بہت سے امور معطل رہیں گے۔ پس بعض لوگوں کا اس میں وسوسہ میں پڑ جانا تعجب خیز ہے بلکہ ایسا ہے جیسے انہوں نے فقہ کا اصلاً ذائقہ تک نہیں چکھا ہے، نہ انہوں نے ائمہؑ کے اقوال کے انداز اور اسرار و رموز کو سمجھا ہے اور نہ ہی امامؑ کے اس فرمان کے مقصود پر غور کیا ہے کہ جس میں فرماتے ہیں کہ بتحقیق میں نے انہیں تمہارے اوپر حاکم، قاضی، حجت اور جانشین وغیرہ مقرر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانِ غیبت میں شیعوں کے وہ کثیر امور منظّم ہو جائیں جن میں وہ ائمہ علیہم السلام کی طرف رجوع کرتے ہیں......

پس جو شخص بھی یہ نظریہ رکھتا ہو کہ دین کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں، شریعت کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں تو اس نے دین، فقہ و شریعت کا ذائقہ ہی نہیں چکھا ہے بلکہ اس نے فقہ کی خوشبو کو سونگھا ہی نہیں ہے یعنی وہ کہیں اور زندگی گزار کے آیا ہے۔ اس کو معلوم ہی نہیں ہے کہ اسلام ہے کیا؟ یہ پتا نہیں کیا پڑھ کر آیا ہے؟

یہ اس فقیہ کا کہنا ہے جو ایک سنتی و روایتی فقیہ ہے اور تہہ شریعت میں اترا ہے۔ صاحبِ جواہر کی علمی حیثیت سب کے لئے اور کم از کم فقہائے امامیہ کے لئے قابل قبول ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر شریعتی کا کہنا ہے کہ مجھے سب سے بڑا دکھ بے دین روشن فکری، سکیولر اور لبرل روشن فکری سے ہے اور یہ ان روشن فکروں کی خیانت ہے کہ جنہوں نے مسیحیت سے یہ ماڈل اٹھایا کہ دین کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اسے اسلام میں فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ ڈاکٹر شریعتی خود بھی روشن فکر ہیں لیکن ان کے نزدیک یہ غیر متعہدانہ روشن فکری ہے۔ ایک غیر دینی زندگی کی تصویر پیش کرنا ان کے نزدیک دین، شریعت اور انسانی معاشرہ کے ساتھ بہت بڑی خیانت ہے۔

......دین و سیاست کی جدائی کا فرسودہ نعرہ

بعض شعار اور نعرے اسرائیلیات کے طور پر مسلمانوں میں سرایت کر گئے ہیں۔ از جملہ دین اور سیاست کی جدائی کا عندیہ اغیار کا نظریہ ہے۔ اگر کوئی مسلمان یہ جملہ ادا کرے کہ دین کا سیاست سے کوئی تعلق

نہیں ہے اور پھر کہے کہ یہ میرا اپنا نظریہ ہے تو یہ ایسے ہے کہ ٹیپ ریکارڈر میں پڑی ہوئی کیسٹ کو یہ گمان ہونے لگے کہ جو کچھ مجھ سے ادا ہو رہا ہے، یہ سب میرے اپنے افکار ہیں۔ اگر کیسٹ قرآن پر ہاتھ رکھ کر بھی کہے کہ یہ میرے اپنے نظریات و افکار ہیں تو کیا آپ مانیں گے؟

چونکہ یہ بے جان ہے اور ہمیں پتا ہے کہ یہ اس قابل نہیں کہ خود اپنا نظریہ بنا سکے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ کیسے مدعی ہے کہ یہ اس کے اپنے افکار ہیں جبکہ ہم نے خود یہ افکار اس میں ریکارڈ کئے ہیں۔ آپ تعجب سے ہنسیں گے کہ عجب، ابھی تو ہم نے اس میں یہ افکار بھرے اور اب ہمیں لوٹ کر کہہ رہی ہے کہ یہ میرے افکار ہیں۔ ہم میں سے اکثر کی یہ حالت ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں کہ گھروں، منبروں یا اِدھر اُدھر جم گھٹوں میں باتیں کرتے یا سنتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے اپنے افکار ہیں لیکن جنہوں نے یہ افکار بھرے ہیں وہ تبسم کرتے ہیں کہ دیکھو کتنے نالائق ہیں کہ جو افکار ہم نے ان میں پھونکے ہیں یہ انہیں اپنے افکار سمجھتے ہیں۔

ہم میں سے اکثر لوگ میڈیا کی کیسٹز ہیں جو دوسروں کی ترجمان ہیں۔ پیچھے کوئی اور ہے لیکن بول ہم رہے ہیں اور ممکن ہے ہمیں توجہ بھی نہ ہو۔ جب ایک آدمی ہزاروں کے مجمع میں شعلہ بیانی کر کے آخر میں کہتا ہے کہ یہ حقیر اپنی زحمت سے یہ افکار آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے تو جس نے یہ باتیں اس کے ذہن میں بھری ہیں وہ پیچھے بیٹھا ہنس رہا ہوتا ہے۔

شیطان بھی انسان کے اندر اسی طرح سے واردات کرتا ہے۔ وہ انسان کو اپنا سپورٹ مین بنا دیتا ہے پھر وہ شیطان کی ترجمانی کرتا ہے۔ شیطان اپنے سپورٹ مین سے کہتا ہے کہ افکار میں بناؤں گا لیکن مجھے ایک اسپیکر کی ضرورت ہے۔

جس طرح آپ انٹرنیٹ کھولیں تو وہ آپ کی مغز کی سائٹ کو اپ لوڈ (Upload) کرتا جاتا ہے، پتا نہیں اس کے پیچھے ایڈیٹر کون بیٹھا ہوا ہے۔ پھر آپ دوسروں کو بتاتے ہیں کہ یہ میرے اپنے افکار ہیں اور دوسرے سامعین بیٹھ کر اس کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرتے ہیں کہ یہ بڑے قیمتی افکار، اچھے تجزیے

اور بے مثل آراء ہیں۔

لہٰذا یہ جملہ کہ دین کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے، کسی مسلمان کا اپنا جملہ نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً جب ایک اہل علم کی زبان سے نکلے تو اسے باور کر لینا چاہئے کہ یہ اس کا اپنا جملہ نہیں بلکہ کسی کا اپ لوڈ کردہ ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ یہ میری اپنی بات ہے جبکہ یہ اسے ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو یا ریسور کے طور پر پیش کر رہا ہے۔

آخر ہمارے چینلز بھی تو کہاں کہاں سے جا ملتے ہیں لہٰذا یہ جملہ بھی کسی ریڈیو اسٹیشن سے پکڑ لیا اور جب ہمارے ریکارڈ میں آ گیا تو اب بار بار زبان سے نکلتا ہے کہ اسلام کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یقین کر لیجئے یہ اغیار کا نظریہ ہے۔ یہ اسلامی نظریہ نہیں ہوسکتا جیسا کہ روایات میں بھی آیا ہے مثلاً امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی منقول ہے:

یَجْرِیْ کَمَا یَجْرِی الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ......[1]

ترجمہ: (یہ قرآن) قائم ودائم رہے گا جس طرح شمس وقمر قائم ودائم ہیں......

قرآن مجید سورج اور چاند کی مانند ہے، جس طرح سورج اور چاند ہر روز نیا طلوع کرتے ہیں اسی طرح قرآن کا ہر روز نیا طلوع ہوتا ہے۔ جس طرح سے خدا نے سورج کو ایسا بنایا ہے کہ روزانہ طلوع کرے اور روزانہ نئی روشنی دے، ہر نسل اور ہر زمانے کے لوگ اس نور سے فائدہ اٹھائیں اسی طرح قرآن بھی ہے کہ ہر نسل اور ہر زمانے کے لوگ نورِ قرآن سے مستفید ہوں۔

اس لئے قرآن کا لب ولہجہ ہر کلام سے جدا ہے۔ قرآن کا اپنا خاص طرزِ بیان ہے جو کسی بھی کلام میں نہیں پایا جاتا۔ آج کل عام طور پر بین الاقوامی معاہدوں اور قراردادوں میں ڈپلومیسی اور سفارتی زبان استعمال کی جاتی ہے جو ایک خاص قسم کی زبان ہے۔ ڈپلومیسی زبان میں سفارت کار اپنے تحفظات کا خیال رکھتے ہیں

---

[1]......(بصائر الدرجات -ابوجعفر محمد بن الحسن بن فروخ "الصفار رحمہ اللہ"،من اصحاب الامام الحسن العسکری علیہ السلام،المتوفی ۲۹۰ھ)(بحار الأنوار- علامه مجلسی رحمہ اللہ،الجزء۸۹،صفحه۹۷)

یعنی ایسی زبان استعمال کرتے ہیں کہ اگر کل ضرورت ہوئی تو اسے اپنے حق میں تبدیل کرسکیں یا اس سے مناسب استفادہ کرسکیں لیکن قرآن کریم کوئی سفارتی دستاویز نہیں ہے کہ اختلاف یا جھگڑے کے وقت اسے اپنے حق میں تبدیل کردیا جائے۔

نتیجہ کے طور پر کہیں گے کہ چونکہ قرآن ہر زمانے اور ہر دور کے لئے ہے لہٰذا اس کے لب ولہجہ میں اتنی گنجائش ہے کہ ہر دور کے لئے عملی ہوسکے۔اب یہاں بہت سارے سوالوں کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ قرآن میں یہ چیز اور وہ چیز کیوں نہیں ہے؟

......اسلام دینِ اجتماعیت

قرآن کریم تمام ادیان کا جامع ترین منبع ہے۔قرآنِ مجید نے جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے وہ دین کا اجتماعی پہلو ہے لہٰذا دین اسلام بھی ایک جامع دین ہے۔جامعیت دین اسلام کا محوری اور بنیادی ترین عنصر ہے۔

جامعیت سے مراد یہ ہے کہ اس کے پاس زندگی کے تمام پہلوؤں اور شعبوں کے لئے دستور موجود ہے لہٰذا دین کے لئے سب سے زیادہ نقصان دہ ترین چیز یہی ہے کہ اس سے جامعیت کا پہلو نکال دیا جائے۔ یعنی دین کو کاٹ کر اس کے حصے بخرے کردیں جیسے ایک انسان کے سارے اعضاء وجوارح کاٹ کر جدا کردیں۔جس دین سے اجتماعیت اور جامعیت کا پہلو نکال دیا جائے وہ خود بخود لوگوں کی زندگی سے باہر جانے کے لئے آمادہ ہو جائے گا اور اس کی جگہ سکیولرازم حاکم ہو جائے گا۔

قرآن مجید نے انسانی زندگی کے کسی بھی شعبہ سے غفلت نہیں برتی۔اس میں کوئی بھی شعبۂ حیات نظرانداز نہیں ہوا ہے لیکن یہ ذہن میں رہے کہ قرآنِ کریم میں فقط کلیات ہیں جو ہر زمانے اور ہر نسل کے لئے ہیں۔زمانوں میں تغیر وتبدل آتا رہے گا لیکن قرآنی تعلیمات کا اسلوب یہ ہے کہ ہر زمانے کے لئے اس میں ہدایت اور راہنمائی موجود ہے۔ورنہ اگر ایک خاص زمانے کے افراد کا نام لے کر لکھ دیا جائے تو پھر وہ اگلی نسل

کے لئے عملی نہیں ہوسکتا۔قرآن کریم کا لب ولہجہ ایسا ہے کہ فقط کسی خاص فرد، کسی خاص ماحول یا مکان وزمان کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔اگر یہ کچھ ہوتا تو پھر قرآن صرف ایک ہی زمانے کے لئے مخصوص ہو جاتا۔قرآن کے مطالب کلی اور عام ہیں جو ہر زمانے اور ہر نسل کے لئے ہیں۔

یہاں ایک نمونہ پر توجہ فرمائیں کہ اس آیتِ کریمہ کا کتنا خوبصورت مطلب نکلتا ہے:

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا...... [1]

اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ نہ ڈالو......

حبل خدا، ہدایتِ الٰہی سے سب مل کر تمسک کرو۔ یہ نکتہ بھی اپنے استادِ گرامی حضرت جوادی آملی مدظلہ سے نقل کرتا ہوں کہ قرآن کریم کہتا ہے تم سب مل کر جمیعاً ہدایتِ الٰہی سے تمسک کرو۔ یہاں قرآن نے تمثیلی زبان استعمال کی ہے۔یعنی دین خدا اور ہدایتِ الٰہی نجات کی ایک رسی ہے۔ اس لئے کہ جو کنوئیں میں گر جائے اس کو نکالنے کے لئے رسی پھینکی جاتی ہے، گرے ہوئے کو رسی کے ذریعہ سے نکالا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایتِ دین اور قرآن کو رسی سے تعبیر کیا ہے۔ کچھ اور بھی کہا جا سکتا تھا لیکن ''حبل اللہ (اللہ کی رسی)'' کی تعبیر آئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کنوؤں میں گرے ہوئے ہیں، ہلاکت کی اتھاہ گہرائی میں ہیں اور اسفل السافلین تک جا رہے ہیں لہٰذا ضلالت وگمراہی کے کنوؤں سے نجات کیلئے جو چیز بھی استعمال ہوگی وہ لامحالہ رسی ہوگی۔

پھر ایک آدمی کنوئیں میں ہے یا تم سب کے سب کنوئیں میں ہو؟ قرآن فرماتا ہے:

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ...... [2]

تمام انسان خسارے میں ہیں۔

یوں نہیں ہے کہ کوئی خاص فرد خسارے میں ہے بلکہ تم سب کے سب خسارے میں ہو لہٰذا نجات بھی

1......(سورۂ آلِ عمران/۱۰۳)

2......(سورۃ العصر/۲)

باہم اورمل کر ہوگی۔اگرآپ اکیلے کنوئیں سے باہرآئے بھی تو دوبارہ آپ کو دھکا دے کر نیچے پھینک دیا جائے گا۔یعنی بے شک جو چالاک ہیں وہ خودکو کسی نا کسی طریقے سے نجات دے دیتے ہیں لیکن ان کو پھر واپس کر دیا جائے گا۔کیوں؟اس لئے کہ اس ہلاکت سے نجات باہم مل کرملنی چاہئے۔اس لئے کہ یہ اجتماعی نجات ہے اور اگراجتماعی نجات نہ ملی تو اجتماعی فساد سے نجات یافتہ پھر آلودہ ہوجائے گا۔اس لئے حکم ہے کہ جمیعاً سب مل کے رسی پکڑو۔اگرایک فرد بھی رہ جائے تو وہ پورے اجتماع کو تباہ کرسکتا ہے۔

پس اگرہم الگ الگ طور پر رسی پکڑیں مثلاً کوئی اپنے گھر میں رسی پکڑا بیٹھا رہا،کوئی مسجد میں رسی پکڑا بیٹھا رہا تو اس آیت پرہم میں سے کسی نے عمل نہیں کیا چونکہ آیت تمسکِ اجتماعی کا کہہ رہی ہے۔یہ تمسک جو ہم نے کیا ہوا ہے یہ تو تمسکِ انفرادی ہے۔

لہٰذا اگرحبل اللہ سے تمسک کرنا ہے تو جمیعاً کرنا ہے۔پھرآیت فرماتی ہے کہ گروہ گروہ نہیں بننا ہے۔گروہی تمسک بھی قابل قبول نہیں ہے بلکہ تمام مومنین اور مسلمین مل جل کر ولایت اور ہدایت سے جمیعاً تمسک کریں تو نجات ملے گی ورنہ سب کی ہلاکت ہوگی۔

یہاں تک یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسیحیت کے اندر تحریف کے نتیجہ میں دین مسیحیت کا حقیقی چہرہ بگاڑ دیا گیا۔یہاں تک کہ رہبانیت،دنیا سے لاتعلقی،زندگی گریزی،اجتماع سے دوری،دین اور سیاست کی جدائی اور ان جیسے امور مسیحیت کی بنیادی تعلیمات میں سے قرار دئے گئے لہٰذا ایسا دین سکیولرازم کی پیدائش کے لئے بہت ہی مناسب ہے یعنی طبعی طور پر یہ پودا اسی سرزمین پر اٹھے گا جیسے کہ بعض بوٹیوں کے لئے مٹی کا ڈھیر بہت مناسب ماحول ہے یا مکھی ومچھر کی پیدائش کے لئے گندی نالیاں مناسب ماحول ہے۔کبھی دیکھنے میں آیا ہے کہ گلاب کے پھول پر مکھیاں پیدا ہوئی ہوں؟!کبھی سننے میں آیا ہے کہ صاف ستھری نہر پر مچھر پیدا ہونا شروع ہوجائیں؟سکیولرازم گندی نالی پر پیدا ہونے والی مکھی یا مچھر ہے۔اب کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ گلستانِ اسلام میں بھی یہی مکھی یا مچھر پیدا ہوجائے۔

اسلام جوعین سیاست وعین اجتماعیت ہے،جو انسان کی عملی زندگی میں قدم پر قدم پر مداخلت

رکھتا ہے بھلا ایسے دین کو کوئی اجتماع سے نکال سکتا ہے؟! اسلام میں سکیولرازم کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔سکیولرازم کو جنم دینے والے اسباب میں سے ایک سبب بھی اسلام میں نہیں ہے بلکہ ان اسباب کی اضداد اسلام میں پائی جاتی ہیں۔اسلام میں رہبانیت کی جگہ اجتماعیت اور خانقاہ کے بجائے محراب ہے۔محراب یعنی جائے حرب، دشمنوں کے خلاف لڑنے کی جگہ۔

3-دین اور عقل کا معرکہ

سکیولرازم کو جنم دینے والے اسباب میں سے مسیحیت کے اندر دین اور عقل کا معرکہ ہے۔ جہاں بھی دین اور عقل کو ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑا کیا جائے اور ان کے درمیان جنگ چھیڑی جائے تو یقیناً وہاں جو مکتب وجود میں آئے گا وہ سکیولرازم ہے۔فرق نہیں پڑتا خواہ دین مسیحیت ہو، دین اسلام ہو یا جو بھی دین ہو، جب وہ عقل کے مدمقابل ہو جائے تو اس معرکہ آرائی کا نتیجہ سکیولرازم کی فتح و نصرت ہوگی۔

مسیحیت کے اندر اس معرکہ کے بقدر کافی اسباب موجود تھے۔ ارباب کلیسا نے عقل کی مذمت کی، عقلانی افکار رکھنے والے افراد کو اپنے سے دور کیا بلکہ انہیں دھتکارا اور سخت سزائیں دے کر لوگوں کو ان کے ساتھ ارتباط رکھنے سے منع کیا۔ وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ یہ لوگ عقلانیت کی ترویج اور عقل پر اعتماد کرتے تھے۔اسی طرح دین مسیحیت کے اندر بقدر کافی غیر عقلانی مواد بھی موجود تھا مثلاً نظریہ تثلیث جو اس دین کی اساس و بنیاد ہے۔اس بنیاد سے عقل کے ساتھ ایک ستیز اور رزم شروع ہوگئی البتہ نظریہ تثلیث بھی مسیحیت میں تحریف، بشر کی دسترس و دست درازی کا نتیجہ ہے ورنہ حقیقی مسیحیت کا اسلامی عقائد کے ساتھ کوئی فرق نہیں ہے۔

نظریہ تثلیث یعنی پیچیدہ مثلث عقل کے ساتھ کھلی جنگ ہے۔ یہ نظریہ کسی عاقل انسان سے ہضم نہ ہوسکا حتیٰ کہ خود ارباب کلیسا اس نظریہ کی وضاحت نہ کر سکے لیکن اس نظریہ کو دینی رنگ دے کر اور مقدس نظریہ سمجھ کر پھر بھی کہا گیا کہ ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ ایمان کا حصہ ہے اگرچہ عقل اس کو رد کر کے قبول نہ بھی کرے۔

اب ایک چیز جس کو عقل ٹھکرا رہی ہے اور ماننے کے لئے تیار نہیں ہے اس پر دینی تقدس کا رنگ چڑھا کر اس پر ایمان لانا ضروری قرار دیں یہی تو دین اور عقل کی جنگ ہے۔ واضح بات ہے کہ ایسی چیزیں جو خلافِ عقل ہیں اگر کسی بھی بہانے سے انسان پر ٹھونس دی جائیں تو ان کی عمر دراز نہیں ہوتی۔ ممکن ہے ایک مختصر مدت تک کچھ لوگ دھوکا میں آکر اور کچھ لوگ کسی اور وجہ سے اس کو قبول کرلیں لیکن دراز مدت میں جب عقل اس کو روز بروز شدت سے انکار کر کے ٹھکرائے گی تو ایک دن اس کی حقیقت سامنے آجائے گی۔

دین مسیحیت کے ساتھ یہی ہوا۔ سب سے بڑی چیز کہ جس سے دین مسیحیت کو نقصان ہوا وہ دین کو عقل کے مقابلے میں کھڑا کرنا تھا۔ لہٰذا سکیولرازم جو ابتداء میں اربابِ کلیسا کے فساد وفحشاء اور ان کے اخلاقی جرائم کے خلاف ایک آواز تھی آہستہ آہستہ اس سکیولر تحریک نے عقل کی حمایت اور عقل گرائی کا رخ اختیار کیا۔ ایک زمانے میں سکیولرازم کا معنیٰ عقل مداری اور عقل گرائی سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ آج بھی سکیولرازم سے بعض اوقات یہی تأثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ سکیولر ذہنیت، سکیولر مذہب یا سکیولر سٹیٹ سے مقصود یہ ہے کہ جو خالصتاً عقلی نظام، عقلی تقاضوں اور عقلی پیمانوں کے مطابق ہو اور عقل کے مطابق اس کی راہنمائی کی جائے۔

مسیحیت کے اندر غیر عقلانی مواد بہت زیادہ ہیں۔ نظریہ تثلیث نمونہ کے طور پر پیش کیا ورنہ اگر جزئیات میں جائیں تو بہت ہی زیادہ ہیں مثلاً جب اربابِ کلیساء سے خلقت عالم کے بارے میں پوچھا جاتا تھا کہ فلسفہ خلقت کیا ہے؟ یہ عالم ہستی کیوں وجود میں آیا ہے؟ فلسفۂ خلقتِ انسان کیا ہے؟ تو وہ اس قسم کے سوالوں کے جواب میں انتہائی بھونڈی توجیہہ کرتے تھے، انتہائی غلط اور خلافِ عقل دلیلیں دیتے تھے جو عقل کو ہرگز پسند نہیں ہوتی تھیں۔

بعض اوقات تو دلیل یا سوال کرنے کو کفر سمجھتے تھے۔ اگر آپ ایک چیز کی عقلانی تحلیل اور تجزیہ پوچھتے ہیں کہ یہ کام کیوں ہوتا ہے تو وہ لوگ کہتے کہ یہ سوال کرنا کفر ہے لہٰذا سوال نہ کریں۔ جب آپ سے کہا گیا ہے کہ ایمان لے آئیں تو لے آئیں۔ انسان کا کام ایمان لانا ہے لیکن اس کے بارے میں سمجھنا کفر ہے۔ آپ مقصدِ خلقتِ انسان، مقصدِ خلقتِ حیات، مقصدِ خلقتِ کائنات اور کسی چیز کا فلسفہ نہ پوچھیں۔ بس آپ یہ

پوچھیں کہ چرچ اور پاپ نے آپ کے ذمہ کیا لگایا ہے؟ کتنا ٹیکس آپ کے ذمہ لگایا ہے؟ بس یہ ادا کرتے جائیں، یہ سوال نہ کریں کہ یہ کیوں ہے؟ کیسے ہے؟ کب سے ہے؟ اور کہاں تک ہے؟ لہٰذا کسی بھی دین میں یہ عناصر داخل کئے جائیں تو اسے ایک دن انسانی معاشرے سے رختِ سفر باندھنا پڑے گا۔

......یروشلم اوریونان میں پنجہ آزمائی

قرونِ وسطیٰ سے قبل کے زمانے میں یروشلم دین مسیحیت کا اور یونان عقلی مکاتبِ فکر کا مرکز تھا۔ آج بھی حکماء، عقلاء اور فلاسفۂ یونان معروف ہیں۔ ان کی تاریخ قدیم ہے۔ ان فلاسفہ میں سے بعض انبیاء علیہم السلام کے معاصر تھے اور بعض قبل از انبیاءؑ تھے۔ ان میں بعض فلاسفہ بہت شہرۂ آفاق ہیں۔ ان کی علمی شخصیت اس قدر بھاری اور قوی ہے کہ ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود آج بھی فکرِ بشری پر حکومت کرتے ہیں جیسے سقراط، افلاطون، ارسطو یا ان کے اساتید اور شاگردان یا ان کے معاصر دوسرے حکماء۔

یہ وہ سلسلہ تھا جو یونان اور اس کے اردگرد اسکندریہ وغیرہ میں جاری تھا۔ یہ لوگ عقلی مسلک اور عقلی مذہب کے پابند تھے۔ ہر چیز کو سمجھنے کے لئے عقل کو محور اور مدار قرار دیتے تھے۔ ان کے مقابلے میں یروشلم ایک مذہبی اور دینی مرکز تھا۔ جب انہوں نے انجیل میں تصرف کیا اور حضرت مسیح علیہ السلام کے لائے ہوئے الٰہی پیغام کو اپنے ہاتھوں سے تبدیل کیا تو صاف لکھ دیا کہ آیتِ انجیل کا مضمون یہ بنتا ہے کہ یروشلم اور یونان میں سے ایک مرکزِ دین و ایمان ہے اور دوسرا مرکزِ کفر ہے۔ فلاسفہ یونان کو کافر قرار دینے کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ عقلی مباحث چھیڑتے ہیں، عقلی ادلہ دے کر عقلی باتیں کرتے ہیں، ان کا ذریعہ فکر اور معلومات کا منبع عقل ہے جبکہ یروشلم میں جو کچھ ہے وہ وحیٔ الٰہی اور پیغامِ دین ہے۔

......اسلام میں عقل کا مقام

مصنوعی حالات سے ہٹ کر دیکھیں کہ آیا اسلام میں سکیولرازم کی پیدائش کی گنجائش ہے یا نہیں؟ پہلے

جو دو اسباب بیان ہوئے وہاں تو واضح ہے کہ ان دو میں سے کوئی بھی سبب اسلام میں نہیں پایا جاتا۔ اب تیسرا سبب کہ جو عقل اور دین کا معرکہ ہے اس میں نظر کریں کہ اسلام میں بھی یہ معرکہ موجود ہے یا نہیں؟

...........عقل کی تعریف

عقل کی تعریف

عقل کے مختلف اور متعدد معانی بیان کئے گئے ہیں جو مختلف علوم مثلاً فلسفہ اور کلام وغیرہ میں استعمال ہوتے ہیں لیکن یہاں پر عقل سے جو معنٰی مراد ہے وہ انسان کی سوچنے کی قوت (قوہ مفکرہ) ہے یعنی فہم و ادراک کا جو وسیلہ خداوند تعالیٰ نے انسان کو عطا کیا ہے جسے ذہن سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور یہی عقل بھی ہے۔

لغت کے اعتبار سے عقل کا ریشۂ لغوی ''عقال'' ہے۔ عرب اس رسی کو عقال کہتے ہیں جس سے اونٹ کی ٹانگ باندھتے ہیں تا کہ کہیں جا نہ پائے لہٰذا عقل وہ چیز ہے جس سے دوسری شے باندھی جاتی ہے۔ یہ آج کی اصطلاح کے مطابق لاک (Lock) اور قفل کے معانی میں بھی آتی ہے۔ پھر وہ ماجرا بھی مشہور ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ مسجد میں لوگوں کی ہدایت میں مشغول تھے کہ باہر سے ایک اونٹ بانی آ گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ اندر درس ہو رہا ہے تو کہا کہ چلو میں بھی تھوڑی دیر بیٹھ جاؤں، جیسا کہ آج کل لوگ گاڑی پارک کر کے اندر آ جاتے ہیں اس نے بھی اپنا اونٹ باہر کھڑا کیا اور خود اندر آ گیا۔ اب اونٹ کتنی دیر رکتا، بالآخر جانور ہے، اس کے پاس پیٹ ہے لہٰذا وہ مسجد نبی ﷺ سے بہت دور چلا گیا۔

یہ شخص جب باہر آیا تو دیکھا کہ اونٹ نہیں ہے۔ واپس آ کر کہنے لگا کہ یہ عجب نبی ﷺ ہیں، آج میں نے درس سنا جس سے یہ فائدہ ہوا کہ میرا اونٹ بھی گم ہو گیا۔ اس زمانے میں اونٹ رکھنا کوئی آسان بات نہیں تھی، سارا سرمایہ یہی ایک اونٹ ہوتا تھا کیونکہ سارا کام تو اسی اونٹ سے لیا جاتا تھا لہٰذا اس شخص نے شور مچانا شروع کیا کہ ہائے میرا اونٹ! ہائے میرا اونٹ! دین سیکھنے آیا تھا لیکن اپنا اونٹ بھی ہاتھ سے گیا!

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کا اونٹ ڈھونڈ لو ورنہ یہ مسجد النبی ﷺ کو بدنام کرے گا۔ پھر اس

شخص سے فرمایا کہ تم نے اونٹ کہاں باندھا تھا۔ کہا میں نے اونٹ باندھا نہیں تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا کیوں کیا؟ تو کہا کہ مجھے پتا تھا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا رہا ہوں، ہدایت اور نیک کام کے لئے جا رہا ہوں، نیک کاموں میں باندھنے کی ضرورت نہیں ہے، میں خدا کے لئے آیا ہوں تو خدا میرے اونٹ کی نگہبانی کرسکتا ہے، میں اللہ کے بھروسے پر چھوڑ کے آیا ہوں، میں نے اللہ پر توکل کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہ توکل نہیں ہے۔ پہلے اس کی ٹانگ باندھو پھر اللہ پر بھروسہ کرو۔ یہاں پر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ لفظ عقل استعمال کیا:

اِعْقِلْ وَتَوَكَّلْ......[1]

باندھو اور توکل کرو......

لغوی معنٰی سے ہٹ کر بعض دوسری روایات میں بھی عقل کی تعریف آئی ہے جیسے امام صادق علیہ السلام سے کسی نے پوچھا: مَاالْعَقْلُ؟ یعنی عقل کسے کہتے ہیں؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا:

مَا عُبِدَ بِهِ الرَّحْمٰنُ وَاكْتُسِبَ بِهِ الْجِنَانُ......[2]

(عقل وہ ہے) جس کے ذریعے رحمٰن کی عبادت کی جائے اور جنت حاصل کی جائے......

............عقل، اسلام کے منابع میں سے

اسلام عقل کے ساتھ نہ فقط نبرد اور جنگ نہیں کرتا بلکہ عقل کو اپنے منابع میں سے سمجھتا ہے۔ فقہی احکام کے لئے اسلام میں ہمارے پاس چار منابع ہیں:

---

[1]......(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی - شهاب الدین محمود بن عبد الله الحسینی الألوسی،المتوفی: ۱۲۷۰ھ،الجزء٦،صفحه۲۰۳)(شرح نهج البلاغة - ابن ابی الحدید،الجزء۱،صفحه۲۰۱)

[2]......(الکافی-الکلینیؒ، کتاب العقل و الجهل،الجزء ۱،صفحه۱۳)

۱) قرآن

۲) سنت

۳) اجماع

۴) عقل

البتہ یہ چار منابع علمِ فقہ میں ہیں ورنہ دوسرے علوم میں عقل کی دخالت بہت واضح ہے۔فقہ میں ہمارے مجتہدین ان چار منابع میں سے کسی ایک کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔فقیہ جو حکم بیان کرتا ہے تو اپنی جیب سے نہیں نکالتا بلکہ شرعی استنباط کرتے ہوئے ان چار منابع کو اساس قرار دے کر فتویٰ دیتا ہے۔پس جو دین عقل کو اپنے منابع میں سے سمجھتا ہے وہ عقل کے مقابلے میں کیسے آ سکتا ہے؟!

خصوصاً اسلام میں مکتبِ امامیہ اثنا عشری، حسین اور زیبا مکتب ہے کہ جس کی کتب اربعہ میں سے پہلی کتاب اصول الکافی کا سب سے پہلا باب اور عنوان ''کتاب العقل والجہل'' ہے۔عقل کا اتنا مقام ہے کہ اصول کافی میں سب سے پہلے عقل کا تذکرہ آیا ہے البتہ وہ عقل جو دین کے منابع میں سے ہے وہ عقلِ سالم اور عقلِ حقیقی ہے۔ایسی عقل جو مغلوبِ شہوت یا شک وشبہ اور اوہام کا شکار ہے وہ ہرگز منبع دین نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح عقل اور قیاس میں بھی فرق ہے۔ہماری فقہ میں قیاس کی کوئی حیثیت نہیں ہے بلکہ ائمہ علیہم السلام نے سختی سے قیاس سے منع کیا ہے۔قیاس ایک ایسی چیز ہے جو عقل کے نزدیک غلط ہے۔

......قیاسِ منطقی اور قیاسِ فقہی میں فرق

فقہ اور منطق میں قیاس کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور دونوں جگہ اس سے الگ الگ معنٰی مراد لیا جاتا ہے۔فقہ میں قیاس سے مراد یہ ہے کہ دو چیزیں جو آپس میں ملتی جلتی ہوں ان کو ٹیلی کریں، موازنہ کریں، جو حکم ایک چیز کا ہے وہی حکم دوسری کا بھی ہے مثلاً باہر پارکنگ میں ایک ہی ماڈل کے دو گاڑیاں پارک کی ہوئی ہیں۔ان میں سے ایک گاڑی آپ کی ہے لیکن قیاس یہ ہے کہ یہ دوسری گاڑی بھی آپ کی ہے چونکہ دونوں ایک جیسی

ہیں حالانکہ یہ تو عقل بھی کہتی ہے کہ یہ کام غلط ہے لہٰذا قیاس کی مذمت کی گئی ہے۔ قیاس کی دین میں دخالت نہیں ہے۔ قیاس عقل کو نہیں کہتے۔

لیکن وہ قیاس جو منطق اور فلسفہ میں استعمال ہوتا ہے وہ عقل ہے۔ اس کی مذمت نہیں کی گئی ہے بلکہ وہ حجت ہے بلکہ قرآن نے خود اسے استعمال کیا ہے۔

قیاس منطقی ایک مثال سے سمجھ لیں مثلاً اس عالم میں حرکت ہے جیسے سورج حرکت میں ہے، زمین حرکت میں ہے وغیرہ۔ ہر حرکت کے لئے محرک کی ضرورت ہے۔ پس عالم میں جو حرکت ہے اس کا ایک محرک بھی ہے۔ یہ قیاس حجت ہے اور یہی عقل بھی ہے۔

اس لئے روایات میں عقل حجتِ باطنی سے تعبیر کی گئی ہے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حُجَّتَيْنِ: حُجَّةٌ ظَاهِرَةٌ وَحُجَّةٌ بَاطِنَةٌ، فَأَمَّا الظَّاهِرَةُ فَالرُّسُلُ وَالْاَنْبِيَاءُ وَالْاَئِمَّةُ (عليهم السلام)، وَأَمَّا الْبَاطِنَةُ فَالْعُقُولُ......[1]

اللہ کی طرف سے لوگوں پر دو حجتیں ہیں: حجتِ ظاہرہ اور حجتِ باطنہ، پس حجتِ ظاہرہ رسل، انبیاء اور ائمہ علیہم السلام ہیں اور حجتِ باطنہ عقول ہیں۔

اسلام نے عقل کا مقام کس قدر خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ ہر انسان کے لئے دو رسول مبعوث کئے گئے ہیں۔ ایک رسول بیرونی ہے اور ایک رسول دُرُونی ہے۔ رسولِ دُرُونی یہی عقل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تعقل، تفکر اور سوچنے کی قوت عطا کی ہے۔ پھر اسی خدا نے اس صاحب عقل مخلوق کے لئے دین بھی بنایا ہے۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ دین بناتے ہوئے ان تمام صلاحیتوں کو مدنظر رکھا گیا ہے جو خدا نے خلقت میں بشر کے اندر ایجاد کی ہیں مثلاً خلقت کے مرحلے میں انسان کو پیٹ دیا گیا ہے، بھوک لگنے کی صلاحیت عطا کی گئی ہے تو دین بناتے وقت اس پیٹ کو حتمی نظر میں رکھا گیا ہے۔ ورنہ وہ دین کامل نہیں

[1]......(الکافی-الکلینیؒ، الجزء ۱، صفحہ ۲۰)

قیاس منطقی اور قیاس فقہی میں فرق

ہوسکتا جو انسان کے لئے ہو لیکن اس میں انسان کے پیٹ کے لئے کوئی چارہ جوئی نہ ہو۔ پیٹ کے لئے اس سے کہا جائے کہ جا کر خود کوئی طریقۂ کار سوچ لیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ دین ناقص ہے۔ آیات و روایات میں نظامِ معیشت پر کتنی تاکید کی گئی ہے کہ یہ کھائیں وہ نہ کھائیں، یہ حلال وہ حرام ہے، یہ پاک وہ نجس ہے، ان سے اجتناب کریں اور انہیں استعمال کریں۔

چونکہ معدہ انسان کا ایک جزو ہے لہٰذا اسلام میں اس سے متعلق ایک مکمل نظامِ معیشت ہے۔ اگر پیٹ نہ ہوتا تو نظامِ معیشت بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ اسی طرح یہ ممکن نہیں کہ خالقِ عقل اور خالقِ انسان جب انسان کے لئے دین بنائے تو اس میں عقل کو مدِنظر نہ رکھے۔

......دین اور عقل کی جنگ ممکن نہیں

اسلام شناس انسان جو اسلام کی بنیادوں، مبانی اور خصوصاً اسلام کی فکری و نظریاتی بنیادوں سے واقفیت رکھتا ہو، یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ دین اسلام اور عقل میں معرکہ ہے۔ شاید اس کے لئے مضحکہ خیز ترین جملہ یہی ہوگا کہ دین اور عقل میں جنگ ہے۔

لہٰذا دین اسلام اور عقل میں اس تقابل کی کوئی گنجائش تک نہیں ہے کہ ہم یہ تقابل کریں کہ عقل یا دین؟! اور پھر دین کو ترجیح دیں یعنی پہلے دین اور عقل کا ایک موازنہ و مقایسہ کریں پھر بہت ساری دلیلوں سے کہیں کہ اسلام عقل سے بہتر ہے۔ اس چیز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

...........پہلی دلیل

اس بات کی دلیل یہ ہے کہ عقل اسلام کے منابع میں سے ہے۔ جو حکمِ عقلی ہے وہی اسلام کا حکم ہے یعنی عقل کا حکم اسلام کا حکم سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن اور سنت کا حکم اسلام ہی کا حکم ہے چونکہ دونوں اسلام کے منابع میں سے ہیں۔ جس طرح قرآن اور اسلام کی جنگ کا تصور ممکن نہیں اسی طرح عقل اور اسلام کی جنگ

کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

..........دوسری دلیل

اس مدعا کی دوسری دلیل یہ ہے کہ جس خدا نے انسان کو بنایا ہے اسی خدا نے وحی کے ذریعے انسان کے لئے دین مقرر کیا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خدا ایسا دین بنائے جو اپنی ہی مخلوق کے ساتھ متعارض ہو۔ یہ اللہ کی حکمت کے منافی ہے کہ دین وعقل جو دونوں اللہ کے بنائے ہوئے ہیں آپس میں ٹکرا جائیں اور ایک دوسرے کو رد کریں۔ خدائے حکیم کبھی ایسا کام نہیں کرتا۔

لہٰذا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ دین اسلام کے اندر ایک معمولی سی شق بھی عقل کے خلاف ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی عقلی شق بھی دین کے خلاف ہو۔ عقل اور دین کی مخالفت کا معنٰی یہ ہے کہ عقل کہے کہ یہ جو دین کہتا ہے میں اسے نہیں مانتی کیونکہ یہ غلط ہے اور دین کہے کہ یہ جو عقل کہتی ہے میں اسے قبول نہیں کرسکتا۔

..............مغالطہ اور اس کا جواب

ایک مکتب بنام عقلیون اس مغالطہ کا شکار ہوا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب عقل اور وحی (دین) میں کوئی تضاد نہیں ہے تو پھر عقل ہی کافی ہے دین اور انبیاء علیہم السلام کی کیا ضرورت ہے؟ یہ کہتے ہیں کہ لامحالہ دین عقل کی مخالفت کے لئے آیا ہے یا اس کی حمایت کے لئے اور آپ کے بقول دین وعقل میں مخالفت کا تصور تک ممکن نہیں ہے تو پھر دین بھی عقل کی حمایت کرتا ہے لیکن جب عقل پہلے سے موجود ہے اور سب کچھ بتا سکتی ہے تو اس کی حمایت کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ ان کے نزدیک بعثت کا کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک فالتو، عبث اور فضول کام ہے کیونکہ اگر دین نہ بھی ہوتا پھر بھی عقل ہمیں سب کچھ بتا دیتی۔

......................غلط سوال کا غلط جواب

مغالطہ ایک بہت وسیع باب ہے۔علمی اصطلاحات میں مغالطہ کار انسان (لوگوں کو غلطی میں ڈالنے والے انسان) کو سفسطی کہا جاتا ہے۔سوفسطائی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے ایک ایسا طبقہ تھا کہ جس کا کاروبار یا پیشہ وکالت تھا۔یہ لوگ عدالتوں میں اپنے موکل کا دفاع کیا کرتے تھے لہٰذا ان کو مغالطہ اندازی میں بہت مہارت ہوتی تھی۔یہ حق کو باطل، باطل کو حق، ظلم کو عدالت، عدالت کو ظلم، مجرم کو بَری اور بَری کو مجرم ثابت کرواتے تھے۔وکالت اسی طرح کا پیشہ ہے۔لوگ پیسوں کے لئے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔آہستہ آہستہ ان کو یہ گمان ہونے لگا کہ ہم جس چیز کو حق سمجھیں وہ حق ہو جاتی ہے اور جس کو باطل سمجھیں وہ باطل تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حق و باطل فقط ہمارے ذہن میں ہیں۔ہمارے ذہن سے باہر حق اور باطل کوئی چیز ہی نہیں۔

چونکہ یہ سوفسطائی طبقہ بڑا دانشمند، دانشور اور اہل علم طبقہ تھا لہٰذا اپنی قوت علمی کی بناء پر مغالطے کیا کرتا تھا۔بعض اوقات لوگ مغالطے کرتے کرتے خود بھی ان مغالطات کا شکار ہو جاتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے کہ ایک دن کسی نے مذاق میں لوگوں سے آ کر کہا کہ فلاں محلّہ میں نذری حلوا تقسیم ہو رہا ہے۔لوگ اس کی بات کو حقیقت سمجھ کر دوڑنے لگے۔کسی نے پیالہ لیا، کسی نے کوئی اور بڑا ظرف اٹھایا اور حلوا لینے کیلئے دوڑ لگا دی۔جب اس آدمی نے دیکھا کہ سب دوڑے چلے جا رہے ہیں تو اس کو بھی شک ہونے لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو واقعاً وہاں حلوا تقسیم ہو رہا ہو لہٰذا خود بھی پیالہ اٹھا کے دوڑ پڑا۔

یہ ہوتا ہے کہ انسان عمداً اور جان بوجھ کر مغالطہ کاری کرتا ہے لیکن کبھی خود بھی اسی مغالطے کا شکار ہو جاتا ہے۔اس سوفسطائی طبقہ کے ساتھ یہی ہوا کہ دوسروں کو مغالطات میں ڈال ڈال کر ایک دن خود مغالطہ میں آ پڑے۔انہوں نے حقائق کا صاف انکار کیا۔کہا کہ کوئی حقیقت نہیں ہے، حقیقت وہ ہے جو ہم کہتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جب جج کے سامنے کہتے ہیں کہ یہ حق ہے تو وہ کہتا ہے ٹھیک ہے، جب ہم کہتے ہیں یہ باطل ہے تو وہ کہتا ہے ٹھیک ہے یہ باطل ہے۔پس اس کا مطلب ہے کہ حق و باطل ہماری ذہنیت کی پیداوار ہیں۔ہماری ذہنیت سے باہر کوئی حقیقت نہیں ہے۔بعد میں اسی طبقہ کے لوگوں نے ایک پورا مکتب بنام مکتب

شکا کیت تشکیل دیا۔

ابھی بھی ایسے مکاتب یورپ میں موجود ہیں اور ان کا کچھ پرتو ہمارے روشن فکروں کے اندر بھی موجود ہوتا ہے لہٰذا مغالطہ، مغالطہ ہوتا ہے اس کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا کام مغالطہ کاری ہے آپ یہ مغالطہ نہ کریں۔

مغالطے بہت ہیں۔ کسی کو مخمصہ میں ڈالنے کے لئے ایسے چٹکلے چھوڑے جاتے ہیں مثلاً ایک مغالطہ جو کوئی علمی سوال نہیں بلکہ ایک معما و مخمصہ ہے، وہ یہ ہے کہ بتاؤ کیا خداوند تعالیٰ ایک ایسا پتھر خلق کرسکتا ہے جو خود نہ اٹھا سکے؟ یہاں جواب ہاں میں دیں گے یا نہ میں، تیسری کوئی صورت نہیں بنتی۔ اگر کہیں کہ جی ہاں قادر ہے، ایسا پتھر کیوں پیدا نہیں کرسکتا بلکہ اس سے بڑا پتھر پیدا کرسکتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا کام کر دیا جسے اب خود اٹھانے سے عاجز ہے۔ اگر جواب دیں کہ ایسا پتھر خلق کرنے پر قادر نہیں تو پھر بھی خلق کرنے سے عاجز ہوگیا۔ دونوں صورت میں خدا کا عاجز ہونا ثابت ہوتا ہے اور جو خود عاجز ہو وہ خدا کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ مخمصہ اور معما ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو نہ ہاں میں جواب دو اور نہ ہی نہ میں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال ہی سرے سے غلط ہے۔

جہاں سوال ہی غلط ہو وہاں پر جواب ہی نہیں ہوتا ورنہ جواب جو بھی ہو غلط ہوگا۔ اگر کوئی آدمی آپ سے کہے کہ آپ کے سر پر سینگ سبز رنگ کے کیوں ہیں؟ یہ بھی ایک سوال ہے! اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال ہی غلط ہے۔ میرے سر پر سینگ کہاں ہیں؟ کیوں کا جواب اس وقت دیں گے جب سینگ ہوں۔ خوانخواہ غلط سوال کا جواب بھی غلط ہوگا۔

..................خدا ہر شے پر قادر

یہ سوال کہ خداوند ایک ایسا پتھر خلق کرے جو خود نہ اٹھا سکے ایک مغالطہ ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی خلقت اور قدرت شے سے متعلق ہوتی ہیں۔ نظامِ قدرت الٰہی کو قرآن مجید نے کتنے خوبصورت الفاظ میں بیان

کیا ہے:

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ o.....[1]

یہ آیت ہم بارہا پڑھتے ہیں لیکن اگر ہم قرآن کو واقعاً ایک آئیڈیالوجی اور منبع کے طور پر پڑھیں، قرآن کو کم از کم اتنی اہمیت دے دیں کہ جتنی کسی روشن فکر کی کتاب کو دیتے ہیں تو ہمارے لئے بہت ساری راہیں کھل جائیں گی۔ ہم قرآن پڑھتے ہوئے اس پر غور و تدبر نہیں کرتے بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اسے فقط ثواب کے لئے پڑھنا ہے۔ ہمارا خیال ہوتا ہے کہ یہ آیت قافیہ ہے جیسا کہ شعر کے آخر میں قافیہ لگاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ حقیقت بیان ہو رہی ہے، عالم ہستی کی تعبیر ہو رہی ہے کہ خدا ہر شئے پر قادر ہے یعنی قدرتِ خدا کو جو چیز تحمل اور برداشت کر سکتی ہے اس کا شے ہونا ضروری ہے۔ پس شے ہو تو متعلق قدرتِ خدا ہو جائے گی چونکہ آپ کوئی عمل انجام دینا چاہتے ہیں تو اس عمل کو تحمل کرنے کے لئے کوئی ایسی چیز ہونی چاہئے جو اس کو برداشت کر کے قبول کرے مثلاً آپ بہت ماہر پروفیسر ہیں لہٰذا چھ مہینے کا بچہ آپ کی گود میں بٹھا دیا جائے اور کہا جائے کہ اس کو ریاضی اور فزکس وغیرہ پڑھائیں۔ اگر آپ خود کو بہت بڑا ماہر پروفیسر سمجھتے ہیں تو اس کو پڑھائیں ہم آپ کو ماہانہ دس ہزار روپیہ ٹیوشن بھی دیں گے۔ آپ جواب دیں گے کہ میں بیس ہزار روزانہ دوں گا اس کو یہاں سے لے جاؤ۔ کیوں نہیں پڑھا سکتے؟ پروفیسر میں پڑھانے کی طاقت ہے، اس کی صلاحیت اور قدرت میں کوئی شک نہیں ہے لیکن تعلیم لینے والے میں اتنی استعداد اور صلاحیت نہیں کہ وہ سمجھ سکے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات میں تخلیق کی قدرت ہے لیکن جو چیز خلق ہوتی ہے اس کے لئے شرط یہ ہے کہ اس میں خلق ہونے کی صلاحیت ہو، وہ خلقتِ خدا کو قبول کرنے کی استعداد رکھتی ہو۔ مفروضہ سوال میں ایسا پتھر کہ جسے خدا نہ اٹھا سکے، ایک محال چیز ہے، فقط ذہن میں اس کا تصور اور مفہوم ہے لیکن ذہن سے باہر

---

[1].....(سورة المائدة/ ١٢٠)(سورۂ هود/ ٤)(سورة الروم/ ٥٠)(سورة الشوریٰ/ ٩)(سورة الحديد/ ٢)
(سورة التغابن/ ١)(سورة الملك/ ١)

یہ چیز محال ہے۔کوئی بھی محال شے خدا کی قدرت کو قبول اور برداشت نہیں کر سکتی۔

محال شے کو فلاسفہ اپنی زبان میں ''لاشئی'' کہتے ہیں۔آپ لاشئی اور نیستی کے بارے میں سوال کر رہے ہیں۔دوسرے لفظوں میں سوال یوں بنتا ہے کہ کیا خداوند نیستی کو خلق کر سکتا ہے؟نیستی تو قابل خلقت نہیں،نیستی کچھ بھی نہیں ہے۔آپ عالم ہستی اور جو چیزیں اشیاء کے زمرے میں آتی ہیں ان کے متعلق پوچھیں۔اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے لیکن لاشئی اور محال قابل خلقت نہیں جیسا کہ چھ ماہ کا بچہ قابل تعلیم نہیں۔لہٰذا اس قسم کے مغالطات بہت زیادہ ہیں۔

............عقل، دین کی حامی یا مخالف

ان ہی مغالطات میں سے ایک مغالطہ یہ بھی ہے کہ دین عقل کی حمایت کے لئے آیا ہے یا مخالفت کے لئے؟ دونوں صورتوں میں پھنس جاؤ گے۔اگر جواب دیں کہ حمایت کے لئے ہے تو اس کا مطلب ہوا کہ جب عقل پہلے سے اصول زندگی اور دوسری بہت سی چیزیں بتا رہی ہے تو پھر دین کی کیا ضرورت،اتنی زحمت کی کیا ضرورت کہ انبیاءؑ آئے،آسمانی کتابیں آئیں اور دینی انتظام و اہتمام ہوا۔جیسے بعض لوگ اتنے پڑھے لکھے نہیں ہوتے لیکن کسی کو یہ احساس نہیں ہونے دیتے کہ ہم اَن پڑھ ہیں۔پہلے بولتے نہیں ہیں بلکہ کہتے ہیں آپ بات کریں۔جب آپ بات کریں تو کہتے ہیں کہ یہ تو ہمیں پہلے سے پتا تھا،آپ نے کوئی نئی بات نہیں کی۔وہ بیان کرنے والا بے چارہ پشیمان ہوتا ہے کہ ایسی بات کی جو اسے پہلے سے معلوم تھی،حالانکہ معلوم نہیں ہوتی لیکن ویسے ہی کہہ دیتا ہے۔بیان کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں نے عبث اور فالتو کام کیا کیونکہ پہلے سے معلوم باتوں کو آ کر تکرار کرنا اور دہرانا ایک عبث کام لگتا ہے۔

اسی طرح وحی کا نزول بھی عبث ہو جائے گا۔اگر وحی وہی کچھ بیان کرے جو عقل کہتی ہے مثلاً نبی آ کر لوگوں سے کہیں کہ ایھا الناس! عدل قائم کرو،ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو اور لوگ کہیں یہ تو ہمیں پہلے سے معلوم تھا کہ ظلم قبیح ہے اور عدالت بہت اچھی چیز ہے۔خود نبی کو بھی احساس ہو جائے گا کہ ایک فالتو کام کر رہا ہوں اور

اگر وحی اور دین وہ تعلیمات بیان کرے جو عقل کے خلاف ہیں، عقل انہیں ماننے کے لئے تیار نہیں ہے تو عقل اپنی مخالف بات کو کیسے تسلیم کرے گی؟

لہٰذا عقلیون مکتب فکر کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ عقل کے ہوتے ہوئے دین کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔ یہ مکتب، مسیحیت کے بالکل مدمقابل ہے۔ مسیحیت کہتی ہے کہ عقل کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقلی باتوں کو تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔

......فکری کمزوری سے فائدہ اٹھانا

ہم کبھی اپنی زندگی میں بھی من گھڑت دوراہا بنا لیتے ہیں۔ یعنی جب دو غلطیوں میں آ کر کوئی پھنس جاتا ہے تو پھر کہتا ہے کہ جی! اب میں مجبور ہوں یا یہ غلطی کروں یا وہ مثلاً کوئی شخص اپنے جوتے کہیں چھپا کے رکھ دے اور کہے اب میں ننگے پاؤں مجبور ہوں کہ یا آپ کے جوتے پہن لوں یا کسی اور کے۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ ہاں صحیح کہہ رہا ہے کیونکہ اب ننگے پاؤں تو نہیں جا سکتا لہٰذا کسی بھی غلطی کا ارتکاب کر سکتا ہے۔

عالمی سطح سے لے کر انفرادی زندگی تک ایسے من گھڑت دوراہے بہت سامنے آتے ہیں۔ کہتے ہیں مجبور ہو گیا تھا یا یہ غلطی کرتا یا وہ غلطی کرتا۔ پھر اپنے آپ کو بہت سمجھدار قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم نے چھوٹی غلطی کی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب عقل مند انسان دو غلطیوں اور قباحتوں میں پھنس جائے تو چھوٹی غلطی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تم نے اپنا جوتا چھپایا کیوں ہے؟ اسے نکال کر سامنے رکھو، نہ ان کا جوتا پہنو اور نہ کسی اور کا بلکہ اپنا جوتا پہنو۔ یہ من گھڑت دوراہا لوگوں کو مغالطے میں ڈالنے کے لئے ہے۔ تم نہ بڑی غلطی کرو نہ چھوٹی بلکہ جو صحیح راستہ ہے اس پر چلو۔ عقل اور دین کے متعلق جو سوال ہے یہ بھی وہی من گھڑت دوراہا ہے۔ یہ درحقیقت لوگوں کی فکری کمزوری سے فائدہ اٹھانا ہے۔

ہم بہت سارے مفاسد اخلاقی کو برا فعل سمجھتے ہیں لیکن تمام مفاسد اخلاقی سے بڑھ کر سب سے

فکری کمزوری سے فائدہ اٹھانا

زیادہ برافعل یہ ہے کہ انسان کی فکری کمزوری سے فائدہ اٹھایا جائے۔سب سے برا کام، خدا کے نزدیک، عقل کے نزدیک، شریعت اور ضمیر کے نزدیک یہی ہے کہ کسی کی ذہنی وفکری کمزوری سے فائدہ اٹھایا جائے۔متأسفانہ دین کے نام پر بہت سے لوگ یہ فائدہ اٹھاتے بھی ہیں۔لوگوں میں فراست اور ہوشیاری کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے۔کوئی زیادہ سمجھتا ہے کوئی کم۔پیربازی، مرید بازی اور لوگوں کو خُرافات ومُزَخرَفات بتا کر اپنا ہمنوا بنالینا ان کی فکری کمزوری سے فائدہ اٹھانا اور احساسات وجذبات سے کھیلنا ہے۔

انبیاء علیہم السلام اگر لوگوں کی فکری کمزوری سے فائدہ اٹھاتے تو شاید دنیا کے امیر ترین انسان بن جاتے۔ اس لئے کہ لوگوں کو متأثر کرنے کے لئے ان کے پاس بہت کچھ تھا لیکن انبیاء علیہم السلام لوگوں کی فکری کمزوری دور کرنے آئے ہیں حالانکہ جو لوگ فکری طور پر کمزور ہیں انہیں وہ لوگ اچھے لگتے ہیں جو ان کی فکری کمزوری اور جہالت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جو لوگ ان کی جہالت اور فکری کمزوری دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو پسند نہیں کرتے۔

اس لئے اکثر انبیاء علیہم السلام کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کی فکری وعملی راہنمائی کر کے انہیں صحیح راستہ پر لگایا اور انہیں فرعون کے تسلط سے نجات دی لیکن چالیس دن کے اندر سامری نے گوسالہ بنا کر پوری قوم کو دوبارہ گمراہ کر دیا۔گوسالۂ سامری یعنی لوگوں کی فکری کمزوری سے فائدہ اٹھانا۔ چالیس دن نہیں گزرے تھے کہ لوگوں نے سامری کے حق میں جلسے جلوس کئے اور ہر طرف سامری زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے۔حضرت ہارون علیہ السلام تن تنہا ایک گوشہ میں کھڑے حیران وپریشان تھے۔لوگ ہارون علیہ السلام کے پیچھے نہیں آئے حالانکہ حضرت ہارون علیہ السلام لوگوں کی فکری کمزوری دور کرنا چاہتے تھے۔

یہ اس زمانے کا سادہ سامری اور سادہ گوسالہ تھا لیکن اس زمانے کے سامری اور گوسالے بہت پیچیدہ ہیں۔آج کا انسان خود کو بہت عقلمند سمجھتا ہے لیکن سامریوں کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔جو انسان سامری کے پیچھے دوڑتا ہے وہ درحقیقت احمق ترین انسان ہے۔آج سامری ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔اس زمانے کا سامری ایک چالاک سائنسدان تھا جس نے اس وقت کی پیچیدہ ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھا کر زیورات وغیرہ سے

ایسا گوسالہ بنایا جو بولتا تھا اور لوگوں کو اپنی طرف بلاتا تھا لہٰذا سامری نے لوگوں کی فکری کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔

آج کے سامریوں نے گوسالۂ قومیت، گوسالۂ لسانیت اور گوسالۂ جمہوریت جیسے بہت سے گوسالے بنا بنا کر لوگوں کے سامنے کھڑے کردیئے ہیں اور لوگوں کی فکری کمزوری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔مقدس اور نامقدس گوسالے بہت زیادہ ہیں۔ایک سے بڑھ کر ایک بڑا گوسالہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے لگا ہے۔ابھی اگر اس وادی میں چلے گئے تو ہم اپنی بحث سے دور ہو جائیں گے۔

بعض اوقات مغالطہ کار، لوگوں کی فکری کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس طرح کے مخمصے اور مغالطات لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں لہٰذا اگر واقعاً تمہارے اندر ضمیر اور انصاف موجود ہے تو صاف کہہ دو کہ عقل و دین کی مخالفت و موافقت سے متعلق سوال تمہارا بنایا ہوا مغالطہ ہے۔صحیح بات یوں ہے کہ یہ دوراہا نہیں بلکہ من گھڑت بات ہے۔صاف بتاؤ کہ عقل اور دین دونوں انسان کے لئے طریقۂ معرفت ہیں۔

ورنہ اگر مغالطے کرنے ہیں تو یہ بہت زیادہ ہیں۔ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ بتائیں عقل آنکھ کی حمایت کے لئے ہے یا مخالفت کے لئے؟ وہ ہی جواب دیں گے یا کہیں گے حمایت کے لئے یا کہیں گے مخالفت کے لئے۔اگر عقل آنکھ کی حمایت کے لئے آئی ہے تو یہ عبث اور فالتو کام ہے چونکہ عقل کے بغیر بھی آنکھ پہلے سے دیکھ رہی ہے اور اگر کہیں کہ مخالفت کیلئے آئی ہے تو آنکھ اسے پلک جھپکنے کی حد تک دیکھنے کیلئے بھی تیار نہیں ہے جو اس کا مخالف ہو۔

اسی طرح انسان کو معرفت کیلئے پانچ منابع اور ابزار دیئے گئے ہیں لیکن ان منابع کے ہوتے ہوئے انسان کو عقل بھی دی۔اگر عقل ان منابع کی تصدیق اور حمایت کے لئے آئی ہے تو یہ فالتو کام ہے چونکہ عقل سے پہلے یہ پانچوں سب کچھ سمجھتے ہیں اور اگر کہیں گے کہ عقل ان کی مخالفت کے لئے آئی ہے تو جو ان کی مخالفت کرے یہ اسے قبول نہیں کرتے۔پس عقل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

اگر مغالطہ ہی کرنا ہے، کسی کی فکری کمزوری سے فائدہ اٹھانا ہے پھر تو قدم بہ قدم بہت زیادہ فائدہ

اٹھایا جاسکتا ہے۔ ہنر یہ ہے کہ آپ پہلے لوگوں کی فکر کو بلند کریں، ان کو شعور دیں پھر ان کے سامنے بات کریں، پھر گوسالہ لے کر آئیں اور دیکھیں کہ پھر مانتے ہیں یا نہیں؟

اگر واقعاً عالمِ فکر کے پہلوان ہو تو پہلے انہیں کسی بات کی حقانیت کو سمجھنے کے قابل بناؤ، فکری کمزوری سے فائدہ نہ اٹھاؤ، سامری نہ بنو بلکہ انہیں باشعور بنا کر پھر اپنا گوسالہ ان کے سامنے پیش کر کے کہو کہ اس کی پوجا کروگے یا نہیں؟! لوگوں کو مستضعف بنا کر، ذہنی طور پر مفلوج اور کمزور بنا کر ان کے سامنے گوسالہ نہ رکھو۔

......عقل، منبعِ معرفت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو معرفت کے حصول کیلئے کئی منابع دیئے ہیں جن میں ابتدائی ترین معرفت کا منبع وذریعہ انسان کی پانچ حسیں ہیں۔ ان حواس خمسہ کے ذریعے انسان ابتدائی معرفت حاصل کر لیتا ہے اور وہ پانچ حواس یہ ہیں:

۱۔ باصرہ (Sight)

۲۔ سامعہ (Hearing)

۳۔ ذائقہ (Taste)

۴۔ شامہ (Smell)

۵۔ لامسہ (Touch)

یعنی دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے اور لمس کرنے کی قوتیں لیکن ہماری یہ پانچ حسیں تمام کے تمام حقائق کو نہیں سمجھ سکتیں۔ خود آنکھ گواہی دیتی ہے کہ میری دیکھنے کی ایک خاص حد ہے۔ حسِ بینائی اس عالم میں زیادہ سے زیادہ جو چیزیں دیکھ سکتی ہے وہ فقط رنگ اور نور ہے۔ نور اور رنگ سے ہٹ کر آگے اسے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اگر آپ رنگوں کی دنیا سے ذرا باہر جائیں اور نور بھی نہ ہو تو آنکھ کہے گی کہ یہاں مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا مثلاً چھت اور فرش کے درمیان جو خالی فضا نظر آتی ہے یہ خالی ہے یا اس میں کچھ ہے؟ یہ خالی نہیں ہے بلکہ

چھت اور فرش کے درمیان ہوا ہے۔ بہت چھوٹے چھوٹے ذرات ہیں۔اب آنکھ سے پوچھیں اس فضاء میں کیا ہے؟ آنکھ کہے گی کہ کچھ بھی نہیں ہے، اس لئے کہ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔اگر آنکھ کا یہ فتویٰ ہے تو اس آنکھ کو نکلوا دیا جائے۔ واقعاً ایسی آنکھ کا کوئی فائدہ نہیں ہے، یہ آنکھ نہ ہو تو بہتر ہے چونکہ یہ غلط کام کر رہی ہے بلکہ الٹا درس دے رہی ہے۔اگر آنکھ کہہ دے کہ اس فضا میں کچھ تو ہے لیکن مجھے نظر نہیں آ رہا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ ورنہ یہ بیکار آنکھ آپ کو کسی دن گڑھے میں گرا دے گی۔

لہٰذا کبھی بھی یہ نہیں کہتی کہ مجھے جو کچھ دکھائی نہیں دیتا وہ موجود ہی نہیں بلکہ ممکن ہے کہ وہ موجود ہو لیکن مجھے نظر نہیں آ رہا ہے۔ میرے دیکھنے کی ایک خاص حد ہے۔اس حد سے باہر بھی کچھ چیزیں ہیں جو مجھے نظر نہیں آتیں مثلاً آپ کسی صحرا میں کھڑے ہو جائیں اور دور افق تک نظر دوڑائیں۔ایک افق تک تو چیزیں نظر آتی ہیں لیکن افق کے بعد کے لئے آنکھ سے پوچھیں کہ بتاؤ اس سے آگے بھی کچھ ہے یا نہیں؟ آنکھ کیا کہتی ہے؟ بس آخر ہے، زمین یہاں پر ختم ہے، اس سے آگے کچھ بھی نہیں! بلکہ آنکھ کہتی ہے کہ زمین ختم نہیں ہو رہی ہے، اس سے آگے بھی زمین اور بہت ساری چیزیں ہیں لیکن میری حد یہاں پر ختم ہو رہی ہے۔ باانصاف آنکھ ہمیشہ یوں کہتی ہے۔اسی طرح کان کا کام فقط آوازیں سننا ہے لیکن سماعت کی بھی ایک خاص حد ہے۔اس حد سے باہر بھی بہت سی آوازیں ہیں لیکن ہمیں سنائی نہیں دیتیں جیسے ابھی بہت سارے ریڈیو اور ٹی وی چینلز بول رہے ہیں لیکن ہمیں سنائی نہیں دیتے کیونکہ ہماری سماعت کی حد سے باہر ہیں۔ باانصاف سماعت وہ ہے جو کہہ دے کہ کچھ آوازیں میری حد سے باہر ہیں، وہ بھی موجود ہیں لیکن مجھے سنائی نہیں دیتیں۔

اسی طرح دوسرے حواس بھی ہیں۔ سب کا فتویٰ یہ ہے کہ ہمارے سمجھنے کی خاص حدیں ہیں۔ بہت ساری چیزیں ہماری فہم سے باہر ہیں۔ یہ حقائق کا عالم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے جو ہمیں نظر آتا ہے لیکن حواس ہرگز یہ نہیں کہتے کہ جو ہماری حد سے باہر ہیں وہ موجود بھی نہیں ہیں۔تو وہ دنیا اور حقائق جو حواس کے فہم و ادراک سے باہر ہیں ہم ان کو کیسے سمجھیں؟ جو دنیا حواس کی دسترس سے باہر ہے اسے کون کشف کرے گا؟

......عقل، کاشفِ کائنات

اس دنیا کو کشف کرنے کے لئے خداوند تبارک وتعالیٰ نے ہمیں عقل دی ہے لہٰذا جو کچھ حواس درک کرتے ہیں وہ بھی عقل سمجھتی ہے بلکہ عقل کے ذریعے سے حواس بھی درک کرنے پر قادر ہیں، اگر عقل نہ ہوتو حواس کے ادراکات میں بھی ہرج ومرج آجائے گا اور جو کچھ حواس کو سمجھ نہیں آتا وہ عقل درک کرتی ہے مثلاً ریاضی کا یہ سادہ سا فارمولہ (4=2+2)، انسان کی ان پانچ حسوں میں سے میں کون سی حس سے قابلِ ادراک ہے؟ یہ تو حواس خمسہ سے سمجھنے والی چیز نہیں ہے بلکہ یہ فارمولہ فقط عقل سے سمجھ میں آتا ہے لہٰذا ایک نابینا بلکہ جس کی ساری حسیں جواب دے چکی ہوں اسے بھی سمجھ میں آتا ہے کہ دو جمع دو چار ہوتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ کوئی ایسی طاقت ہے کہ جو چیزیں حواس سمجھتے ہیں ان کو بھی سمجھتی ہے اور جو حواس کی حدود سے باہر ہیں ان کو بھی سمجھتی ہے۔ اس قوت کا نام عقل ہے جو ایک بڑی دنیا کے انکشاف کے لئے ہے۔ پس حواس کی موجودگی میں بھی عقل کی ضرورت سمجھی اور مانی جاتی ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ جب حواس موجود ہیں تو عقل کی کیا ضرورت ہے۔ حواس بہت محدود حد تک دیکھنے پر قادر ہیں اس کے بعد عقل کا کام شروع ہو جاتا ہے۔

اب عقل سے پوچھیں کہ بتایئے جو کچھ آپ کو سمجھ میں آتا ہے سو وہ موجود ہے لیکن جو آپ کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کیا وہ موجود ہے یا اصلاً موجود بھی نہیں ہے؟ عقل کیا کہتی ہے؟! کیا واقعاً کسی کی عقل یہ فتویٰ دیتی ہے کہ جو میں نے نہیں سمجھا وہ موجود ہی نہیں ہے؟! آخر آپ نے سمجھا کیا ہے جو آپ کہیں کہ جسے میں نہیں سمجھا وہ موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں ہم نے تو یہ بات نہیں سنی ہے حالانکہ یہ بات وہ کہے جس نے بہت کچھ سنا ہوا ہو پھر کہے کہ یہ بات میں نے نہیں سنی مثلاً جس مولانا نے زندگی بھر کوئی گانا نہیں سنا ہو اس کے سامنے ایک گانا لگا دیا جائے اور وہ سن کر یہ کہہ دے کہ یہ گانا تو میں نے نہیں سنا تھا! تو آپ کہیں گے کہ مولانا صاحب! آپ نے اور کون سا گانا سنا ہے کہ یہی نہیں سنا تھا؟! آپ نے تو اس دنیا کی کوئی چیز سنی ہی نہیں ہے، آپ اس دنیا میں تازہ وارد ہوئے ہیں اور یہ پہلی آواز ہے جو سن رہے ہیں لہٰذا یہ جملہ کہ ہم نے یہ پہلی دفعہ سنا

ہے، یہ بات ہم نے پہلے نہیں سنی تھی یا یہ بات پہلے سمجھ میں نہیں آئی تھی وضاحت کرتی ہے کہ اس سے پہلے باقی سب کچھ سن اور سمجھ چکے تھے یہی ایک چیز رہ گئی تھی مثلاً میں ایک کتاب کا نام لوں تو آپ کہیں کہ اس کتاب کا نام ہم نے پہلی دفعہ سنا ہے۔اس کا مطلب ہے باقی ساری دنیا کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے صرف یہ ایک رہ گئی تھی جو آپ نے نہیں پڑھی۔جس نے کوئی کتاب نہ پڑھی ہو وہ حتیٰ یہ بات بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ میں نے پہلی دفعہ سنا ہے۔

لہٰذا عقل بھی یہ ہرگز نہیں کہہ سکتی کہ جو چیز میں نہیں سمجھ سکی وہ موجود بھی نہیں ہے۔اتنی بڑی کائنات میں ہماری عقل نے سمجھا کیا ہے کہ کہہ دے جو میں نے سمجھا سو وہ موجود ہے اور جو میری سمجھ سے باہر ہے اس کا وجود بھی نہیں ہے۔عقلِ سلیم کبھی بھی ایسا فتویٰ نہیں دیتی۔

.... 'عدم' نظر نہیں آتا

بہت سی چیزوں کو بگاڑ کے پیش کرنے اور مغالطہ میں ڈالنے کا مشغلہ ہماری عادت بن کر لاشعور میں بیٹھ گیا ہے بلکہ ہمارے کلچر وتہذیب کا حصہ بن گیا ہے۔ایک مثال پیش کرتا ہوں آپ اس پر ذرا غور کریں۔ یہ باتیں ذرا غور کرنے کی ہیں مثلاً آپ کسی بندے کو بھیج کر یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھو وہ فلاں صاحب باہر گراؤنڈ میں موجود ہیں یا نہیں؟ روزمرہ ہم بچے کو دوڑاتے ہیں کہ دیکھو کمرے میں ابو موجود ہیں یا نہیں؟ اسی طرح ہزاروں مثالیں ہیں جو روزمرہ ہماری زندگی میں پیش آتی ہیں مثلاً کسی کو بھیجا کہ اس ٹیبل پر گلاس ہے یا نہیں؟ وہ جاکر غور سے دیکھتا ہے اور دیکھنے کے بعد آپ کو رپورٹ دیتا ہے کہ ''میں نے بہت غور سے دیکھا کہ گلاس ٹیبل پر نہیں تھا''۔

اب اس جملہ کو کھولیں۔یہی جملہ جو ہم بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا فلاں دفتر میں نہیں تھا، میں نے دیکھا ابو جان کمرے میں نہیں تھے، میں نے دیکھا میز پر گلاس نہیں تھا، میں نے دیکھا میز پر قلم نہیں تھا۔دیکھیں ہمارے فہم وادراک کی حقیقت کیا ہے؟! ہم کرتے کیا ہیں اور کہتے کیا ہیں؟! ہمارے قول

وفعل میں کتنا فرق ہے؟! یہ جملہ کہ میں نے دیکھا ٹیبل پر گلاس نہیں تھا اس جملہ میں ''میں نے دیکھا'' کا مطلب ہے کہ ایک دیکھنے والا ہے جس نے دیکھنے کا عمل انجام دیا ہے۔ جس کو فارسی اور عربی میں رؤیت کہتے ہیں۔ جہاں رؤیت ہوتی ہے وہاں کوئی مرئی چیز ہوتی ہے کہ جس کو دیکھا جاتا ہے۔ رؤیت بغیر مرئی چیز کے تو نہیں ہوسکتی۔ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ آپ کہہ دیں کہ میں نے آج بہت کچھ دیکھا، جب کوئی پوچھے کہ کیا دیکھا؟ تو آپ کہہ دیں کچھ بھی نہیں۔ یعنی دیکھی ہوئی چیز کوئی بھی نہ ہو اور رؤیت واقع ہوئی ہو، یہ محال ہے۔ حتماً وہ کوئی چیز ہوتی ہے جس کو کوئی دیکھتا ہے جسے عربی میں ''مرئی'' کہتے ہیں۔

پس ہمارے اس جملہ (میں نے دیکھا......) میں دیکھنا ٹیبل پر گلاس کا نہ ہونا ہے۔ یعنی وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے ٹیبل پر گلاس کا نہ ہونا دیکھا۔ اب آپ بتائیں کیا گلاس کا نہ ہونا انسان کو دکھائی دیتا ہے؟! یقیناً ہونا دکھائی دیتا ہے، نہ ہونا تو دکھائی نہیں دیتا۔ آج تک خدا نے ایسی آنکھ نہیں بنائی کہ جو نہ ہونے کو دیکھے۔ کسی چیز کا نہ ہونا قابل رؤیت نہیں ہے۔ یہ عام جملہ جو ہم روزمرہ استعمال کرتے ہیں اور توجہ بھی نہیں کرتے ہیں کہ ہم کرتے کیا ہیں اور کہتے کیا ہیں؟! اصل میں اس شخص کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ ''میں نے ٹیبل پر گلاس کے ہونے کو نہیں دیکھا''۔ یعنی دیکھنے کا فعل انجام ہی نہیں پایا، میری رؤیت ہی نہیں ہوئی اس لئے کہ کوئی مرئی نہیں تھا۔ نہ ہونا کسی انسان کو بھی نظر نہیں آتا۔

عدم نظر نہیں آتا

اب عقل سے پوچھیں کہ جو حقائق آپ کو سمجھ میں آئے ہیں سو وہ موجود ہیں لیکن جو نہیں آئے ہیں آیا وہ موجود ہیں یا نہیں؟! اگر عقل یہ کہے کہ جو مجھے سمجھ میں آتا ہے وہ موجود ہے لیکن جو مجھے سمجھ میں نہیں آتی وہ چیز نہیں ہے تو اس سے زیادہ بیکار اور ناقابل اعتماد عقل کوئی نہیں ہوسکتی لہٰذا عقل کبھی بھی یہ فتویٰ نہیں دیتی۔ اگر عقل یہ فتویٰ دے تو جہان سمٹ کر اتنا ہو جائے گا جتنی ہماری عقل ہے۔ عقل کہتی ہے کہ یہ عالم حقائق سے پر ہے لیکن ہماری عقل اس عالم کو کتنا سمجھتی ہے؟ اس دنیا کے علل و اسباب اور حقائق کو کتنا درک کرتی ہے؟ سالم عقل کہتی ہے کہ اس عالم میں کچھ حقائق مجھے سمجھ میں آتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی حقائق ہیں جو مجھے سمجھ میں نہیں آتے جیسے باانصاف آنکھ بھی یہی کہتی ہے کہ دیکھنے کی بہت چیزیں ہیں لیکن کچھ میں نے دیکھی ہیں اور کچھ میری دید کی

حد سے باہر ہیں۔ جب میری حد ختم ہو جائے تو آگے کسی اور چیز کی مدد سے دیکھو۔ اگر وہ نہیں ہے تو میں بھی دیکھنے پر قادر نہیں ہوں۔ اسی طرح عقل بھی انسان کو ایک حد تک پہنچا دیتی ہے اور پہنچانے کے بعد کہتی ہے کہ میری حد یہاں ختم ہو گئی ہے لیکن حقائق ابھی باقی ہیں۔

......عقل، وحی کی محتاج

لہٰذا انسان ایک دوسرے منبع معرفت کا بھی محتاج ہے جو آ کر عقل کی مدد کرے اور جہاں عقل قاصر ہو اسے سمجھائے۔ عقل خود کہتی ہے کہ یہاں سے آگے ایک اور ذریعۂ معرفت کو ہونا چاہئے۔ اور وہ ذریعۂ معرفت ''وحی'' ہے۔ عقل خود کہتی ہے کہ وحی کا ہونا ضروری ہے۔ اگر عقل نہ ہو تو وحی ثابت نہیں ہو سکتی۔ پس وحی عقل کی مددگار اور حامی ہے۔

وحی کے ذریعے انسان کو بہت سارے حقائق سمجھ میں آتے ہیں۔ جیسا کہ قرآنِ کریم کا یہ کہنا ہے:

عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ○...... [1]

اس نے تمہیں وہ سکھایا ہے جسے تم پہلے نہیں جانتے تھے۔

لہٰذا عقل کی وحی کے ساتھ مخالفت بعض لوگوں کا پیدا کردہ مغالطہ ہے۔ اب اس سوال کا جواب بھی روشن ہوا کہ وحی عقل کی حمایت کیلئے ہے یا مخالفت کیلئے۔ جن موارد میں عقل کی فہم ہے وہاں وحی اس کی حمایت اور راہنمائی کیلئے ہے اور وہ موارد جہاں عقل کی دسترس ہی نہیں، وہاں نہ حمایت کیلئے ہے نہ مخالفت کیلئے! اس لئے کہ ان موارد میں عقل کی کوئی دسترس نہیں ہے بلکہ عقل خود کہتی ہے کہ مجھے بات سمجھ میں نہیں آ رہی لہٰذا کوئی سمجھانے والا، کوئی معلم ہو جو آ کر میری راہنمائی کرے۔ بس نہ کہو کہ وحی عقل کی مخالف ہے یا حامی۔ جہاں عقل کی پہنچ و دسترس نہیں ہے وہاں فقط وحی ہے لہٰذا جہاں تک عقل کی رسائی ہے وہاں عقل کو دین کے منابع میں

عقل، وحی کی محتاج

---

[1]......(سورة البقرة/ ٢٣٩)

رکھا گیا اور جہاں عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی وہاں سے آگے وحی کا کام شروع ہو جاتا ہے۔

......فقہ و عقائد میں عقل کا مقام

کیا وہ لوگ جو دین اسلام کے ابجد سے بھی آشنا نہیں ہیں اسلامی سکیولرازم کی نام نہاد اصطلاح و توجیہہ پیش کر سکتے ہیں؟! حضرت امام خمینیؒ کے بقول آج ایسے لوگ بھی اسلام کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں جنہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اسلام ''س'' سے لکھا جاتا ہے یا ''ص'' سے۔ جو کہتے ہیں کہ اسلام میں یوں ہے، اسلام میں وہ نہیں ہے، اسلام میں سکیولرازم ہے! کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اَن پڑھ متخصصین اسلام کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

حالانکہ انہیں معلوم نہیں ہے کہ دین کے ابتدائی مرحلے یعنی فقہ میں بھی عقل کو بڑا مقام دیا گیا ہے۔ شریعت یعنی حلال وحرام اور واجبات ومحرمات کہ جو کوئی بھی شریعت پر عمل پیرا نہ ہو وہ سرے سے دین سے باہر ہے اس مرحلہ میں بھی علماء وفقہاء نے فقہ کے چار منابع میں عقل کو بھی منبع فقہ کے طور پر ذکر کیا ہے۔ دین بہت وسیع ہے۔ دین میں اعتقادات، اخلاقیات اور احکام بھی ہیں۔ احکام یعنی حلال وحرام، واجبات ومحرمات، مکروہات ومستحبات علم فقہ میں بیان کئے جاتے ہیں جبکہ پورا کا پورا دین علم فقہ نہیں ہے۔ دین اسلام کو اگر ایک گول دائرہ سے تشبیہہ دیں تو فقہ اس دائرہ کے اندر تو ہے لیکن مرکزِ دائرہ سے بہت دور فاصلہ پر ہے۔ دائرہ اسلام کا مرکز توحید ہے۔ توحید تمام اسلامی اصولوں کا مرکزی نقطہ ہے لہٰذا اسلام میں داخل ہونے کیلئے اس دائرہ کے اندر آنا ضروری ہے لیکن اس دائرہ کی باؤنڈری (Boundary) بھی ہے جسے کراس کر کے اندر آنا پڑتا ہے۔ باؤنڈری یہ ہے:

قُوۡلُوۡا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفۡلِحُوۡا......[1]

---

[1]......(میزان الحکمه-الریشهری،الجزء ۱۰،صفحه ۳۰۶)

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہواور نجات پا جاؤ......

کلمہ پڑھوتو مسلمان ہو جاؤ گے۔اب اسلام کے اندر داخل ہو گئے، پہلے نجس تھے اب صاف ستھرے ہو گئے لیکن جو لوگ باؤنڈری پر پڑاؤ ڈال دیں تو گویا ان کا اسلام خطرے میں ہے۔باؤنڈری کراس کر لینے کے بعد ابھی تو بہت آگے مرکز تک جانا ہے۔باؤنڈری سے نقطۂ مرکزی تک پہنچنا ہے۔تمام احکامِ فقہ یعنی واجبات ومحرمات اور حلال وحرام دائرہ اسلام کے اندر ہیں لیکن باؤنڈری کے ساتھ ہیں۔پس جو اس ابتدائی ترین مرحلہ میں بھی گر گیا تو وہ فوراً باہر نکل جائے گا۔

لہٰذا فقہ میں عادل انسان اس کو کہا جاتا ہے جو واجبات کو بجالاتا ہو اور محرمات کو ترک کرتا ہو لیکن اگر اس کے اندر معمولی سی لغزش آجائے تو فاسق وفاجر ہو جاتا ہے۔فاسق یعنی خارج ہونے والا۔یعنی دوبارہ باؤنڈری کراس کر کے باہر چلا گیا۔اب اس کے پیچھے نماز بھی نہیں پڑھی جاسکتی چونکہ امام جماعت کے لئے عدالت شرط ہے۔ایسا عادل انسان کہ معمولی سی غلطی سے دین سے باہر جانا پڑے۔اس کا مطلب ہے کہ یہ انسان ابھی تک سرحد نشین ہے۔یہ دین کے ابتدائی مرحلہ میں ہے اور اب تک مرکز تک نہیں پہنچا۔

عموماً سمگلر قسم کے لوگ سرحدوں پر رہتے ہیں کیونکہ انہیں مال کو کبھی سرحد کے اس پار پہنچانا ہوتا ہے اور کبھی اُس پار۔یہ لوگ کبھی بھی دارالخلافہ اور کیپٹل میں نہیں آتے چونکہ سرحدوں میں رہنے سے ان کو فائدہ ہے۔اسی طرح کچھ لوگ جان بوجھ کر اسلام کی سرحدوں پر رہتے ہیں کہ اگر دین میں فائدہ ہے تو دین کا جھنڈا اٹھالو اور اگر کبھی قومیت کا دور دورہ ہے تو قومیت کا جھنڈا اٹھالو۔باؤنڈری پر رہ کر جو روپ اپنالو لیکن کسی بھی مرکز میں نہیں جانا چونکہ مرکز سے نکلتے نکلتے دیر لگتی ہے۔

اسلام کہتا ہے کہ اس سرحد کے ساتھ پڑاؤ مت ڈالو بلکہ دائرہ کے اندر مرکز تک جاؤ۔خدانخواستہ اگر کوئی لغزش بھی ہو جائے، اگر گر بھی جاؤ تو دائرہ سے باہر نہیں گرو گے، فاسق نہیں بنو گے، پھر بھی دو آدمی تیرے پیچھے نماز پڑھ سکیں گے یعنی کم از کم عدالت باقی رہے گی لیکن جو ابتدائی ترین مرحلہ میں گرے گا وہ دائرۂ اسلام سے باہر گرے گا۔پس اس ابتدائی ترین مرحلے یعنی فروعِ دین میں بھی عقل کی کارکردگی بہت روشن ہے۔اس

لئے کہ منابع فقہ میں سے ایک منبع عقل بھی ہے۔

اسی طرح اصول دین یعنی توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت پر اعتقادات کہاں سے حاصل کریں گے؟ اگر کسی روایت یا آیت کے ذریعے سے خدا کو مانا ہے تو یہ بات قابل قبول نہیں بلکہ اس اعتقاد کے پیچھے دلیل عقلی کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی فقط عقل کا حصہ ہے۔ یہاں فقط عقل کے راستے سے پہنچنا ہے۔

دین و عقل کا لایعنی مقابلہ

پس ایسا دین جس کی بنیاد یں، جس کے اصول اور فروع عقلی ہیں یعنی عقل کے بغیر ناقص ہیں اس دین کو عقل کے خلاف لاکر کھڑا کرنا خود عقل کے خلاف ہے۔ وہ دین جو محض عقلانیت ہے، جس دین، خدا، نبوت، امامت اور قیامت تک انسان کو عقل نے پہنچایا اس دین کے خلاف نہضتِ عقلی چلانا خود حماقت اور کم عقلی کی دلیل ہے لہٰذا ایسے دین میں کہ جو عقل کو اتنی اہمیت دیتا ہے، جس کی کوئی شق عقل کے خلاف نہیں ہے، سکیولرازم کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

لہٰذا عقل و دین کا معرکہ پیدا کرنا ایک مصنوعی بحران ہے البتہ مسیحیت کے اندر یہ طبعی بحران تھا لیکن بعض لوگوں نے یہ بحران مصنوعی طور پر اسلام کے اندر بھی لانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں پر دینداروں کو بہت خیال رکھنا چاہئے۔ سکیولرازم کی پیدائش میں سب سے بڑا کردار مسیحی دینداروں کا ہے۔ انہوں نے اپنے دین کے ساتھ خیانت کی ہے۔ دین کے خاتمہ میں جتنا کردار دینداروں کا ہے اتنا کسی اور کا نہیں ہے۔ وہ مسیحی علماء جنہوں نے عقل کی مخالفت کی کہ جس کی وجہ سے دین کو معاشرہ سے باہر جانا پڑا، سب کے سب ذمہ دار ہیں۔

4- دین اور علم وسائنس کی جنگ

مسیحی طرز تدین باعث بنا کہ دین کے خلاف ایک نہضت اور تحریک شروع ہوئی جو مرحلہ وار ترقی کر کے سکیولرازم تک آ پہنچی۔ اس تحریک یا مکتب کے وجود میں آنے کے لئے دین مسیحیت کے اندر طبعی

طور پر کچھ عوامل موجود تھے جن کی وجہ سے یہ تحریک اٹھی اور پورے یورپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان علل واسباب میں سے ایک علت یہ تھی کہ دین مسیحیت کی ایسی شکل بنائی گئی کہ دین، سائنس، اختراعات اور جدید علمی انکشافات کو قبول نہیں کرتا۔ جو بھی اس مد میں حرکت کرتا یا سوچتا وہ درحقیقت ایک غیر دینی کام میں مشغول سمجھا جاتا تھا۔

یعنی باقاعدہ طور پر علوم کو علومِ دین اور علومِ دنیا میں تقسیم کر دیا گیا۔ علوم دین مقدس اور دنیاوی علوم غیر مقدس سمجھے جاتے تھے بلکہ جہاں علومِ دنیاوی کا کوئی فارمولہ دین کی کسی شق کے مقابلے میں سمجھا جاتا ان کو ناجائز سمجھ کر ان پر قدغن لگائی جاتی تھی۔ اسی طرح بہت سارے علوم کے پڑھنے پڑھانے پر رسماً پابندی تھی۔ علوم عقلی جیسے منطق، فلسفہ وکلام اور اسی طرح علوم تجربی یعنی سائنس اور جدید علمی انکشافات پر پابندیاں عائد کی گئیں تھیں حتیٰ کہ ان علوم کو پڑھنے، پڑھانے والوں کو سزائیں دی جاتی تھیں۔ ''گیلیلیو'' کو فقط اس بناء پر کہ اس نے زمین کی حرکت کے متعلق ایک نظریہ پیش کیا جو دین مسیحیت کے ساتھ سازگار نہیں تھا، موت کے دھانے پر جا پہنچنا پڑا۔ اس کو سخت سے سخت سزائیں دے کر توبہ کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جو بھی زمین، آسمان اور کرات سماوی کے بارے میں اظہار نظر کرتا اس کو صراحتاً کفر سے متہم کیا جاتا۔ اسے کافر قرار دے کر موت کے گھاٹ پر پہنچایا جاتا تھا۔

ایسا دین کہ جو عقلانیت کی مخالفت کے ساتھ ساتھ علمیت، سائنس اور جدید انکشافات کی بھی سختی سے مخالفت کرنا شروع کرے بالآخر اس دین کو ایک دن انسانی معاشرہ سے باہر جانا پڑتا ہے حالانکہ علم حاصل کرنا ہر انسان کا فطری حق ہے۔ اگر دین انسان کو اس فطری حق سے محروم کرے تو خوانخواہ اس دین کے خلاف احساسات وجذبات ابھریں گے۔

لہٰذا سکیولر تحریک نے ایک مرحلہ میں علم گرائی، علم طلبی اور علم خواہی کی شکل اختیار کر لی۔ ایک اچھا خاصا زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جس میں سکیولر انسان سے مراد علم دوست اور علم کی حقانیت کا قائل لیا جاتا تھا جیسا کہ کسی زمانے میں سکیولر کا معنیٰ عقل کا حامی سمجھا جاتا تھا۔

اس دین اور علم وسائنس کی معرکہ آرائی کا طبعی نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ دین سے بیزار ہوگئے، دین کو صحنۂ بشریت سے باہر جانا پڑا اور اس کی جگہ سکیولرازم کو لا کر کھڑا کیا گیا۔ پھر علم و دین کے بحران اور معرکہ آرائی کو مصنوعی طور پر اسلام میں بھی داخل کرنے کی کوششیں کی گئیں حتیٰ کہ مسلمانوں میں ایک زمانہ ایسا گزرا ہے کہ لوگ علوم عقلی کو پڑھنے سے ڈرتے تھے اور عقلی باتوں سے کتراتے تھے۔ ابن تیمیہ جو بانیٔ مکتبِ وہابیت ہے اس کا مشہور فتویٰ ہے کہ ''من تمنطق فقد تزندق ''، یعنی جو منطق پڑھے وہ زندیق ہے۔ یہاں مسلمانوں میں علوم عقلی وعلوم تجربی کی مخالفت میں شاید ایک دو نمونے مل سکتے ہیں لیکن مسیحیت نے رسمی طور پر علوم تجربی وعلوم عقلی کی مخالفت کی۔

......اسلام میں علم کی اہمیت

دین مقدس اسلام میں علم اور اہل علم کی اہمیت اتنی واضح وروشن ہے کہ حتیٰ بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ علم کی تلاش انسان کا فطری امر ہے۔ انسان فطری طور پر جستجو گر ہے۔ انسان کے اندر حس کنجکاوی موجود ہے حتیٰ کہ ان امور میں کہ جہاں اس کو فائدہ نہ بھی ہو ان کے متعلق بھی جاننا چاہتا ہے۔ انسان فطری طور پر ہر چیز کو سمجھنے کی تلاش میں ہے اور اسلام نے انسان کے اس فطری تقاضے کو مزید اجاگر کرنے کی تلقین کی ہے۔

علم کی اہمیت کے بارے میں آیات اور احادیث بہت ہی زیادہ ہیں۔ منجملہ:

هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ......[1]

کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے یکساں ہو سکتے ہیں؟!......

اسی طرح مشہور احادیثِ مبارکہ ہیں:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ......[2]

---

[1] ......(سورۂ زمر/۹) [2]......(الکافی-الکلینیؒ، کتاب فضل العلم، باب: فرض العلم ووجوب، الجزء۱، صفحہ۳۸)

علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے......

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَی اللَّحْدِ......[1]

علم حاصل کرو، ماں کی گود سے قبر تک......

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّیْنِ......[2]

علم حاصل کرو چاہے اس کیلئے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے......

اس قسم کی احادیث کثرت سے موجود ہیں۔

اب اگر انسان کو اس فطری حق سے محروم کیا جائے تو خوانخواہ اس دین کے خلاف احساسات وجذبات ابھریں گے اور لوگوں کو شدت سے احساس ہوگا کہ یہ دین فطرتِ انسان کے ساتھ ہرگز سازگار نہیں ہے لہٰذا اسلام نے کبھی بھی لوگوں کو علم سیکھنے سے نہیں روکا بلکہ علم کی ترویج اور فروغ کیلئے جتنا اہتمام اسلام نے کیا ہے اتنا کسی بھی مکتبِ فکر نے نہیں کیا۔

ایک بہت معمولی سا واقعہ جو ہم نے بار ہا پڑھا اور سنا ہے اس پر غور کریں تو بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ اسلام میں لکھنے پڑھنے کو کتنی اہمیت دی گئی ہے۔ جنگِ بدر جو اسلامی حکومت بننے کے بعد مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے درمیان لڑی جانے والی سب سے پہلی جنگ ہے اس کی تیاری کیلئے مسلمانوں کے پاس طاقت، افرادی قوت اور جنگی ساز و سامان کی انتہائی کمی تھی۔ نئی تأسیس شدہ حکومت کے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا، بیت المال کا تو نام ہی نہیں تھا کیونکہ خزانہ بالکل خالی تھا، افلاس اور بھوک کا عالم تھا، مکہ سے آئے ہوئے تازہ مہاجرین خالی ہاتھ تھے، انصاری بھی اتنی اچھی حالت میں نہیں تھے۔ اتنے میں جنگِ بدر چھڑ جاتی ہے۔ مشرکین کے ایک ہزار لشکر کے مقابلے میں مسلمانوں کی کل تعداد تین سو تیرہ تھی، چند افراد کے پاس تلواریں تھیں باقی سارے لوگ خالی ہاتھ تھے، لڑنے کے لئے ان کے پاس نہ گھوڑا تھا نہ شمشیر لیکن اللہ پر توکل کر کے نکلے۔ جب مشرکین مکہ

---

[1]......(تفسیر قمی-علی بن ابراھیم قمیؒ)　[2]......(بحار الانوار-علامہ مجلسیؒ، الجزء۱، صفحہ۱۷۷)

کے ساتھ بدر کے مقام پر آمنا سامنا ہوا تو زبردست مقابلہ کے بعد آخر کار نصرتِ الٰہی مسلمانوں کے شامل حال ہوئی اور مشرکین کو زبردست شکست اٹھانی پڑی۔ بہت سارے مشرکین مارے گئے اور جو بچ گئے وہ بھاگنے پر مجبور ہوئے۔ مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا اور ستر آدمیوں کو زندہ پکڑ کر کے انہیں قیدی بنالیا۔

جب ان مشرکین کو اسیر کر کے مدینہ لے آئے تو اور اب مسلمان صلاح و مشورہ کرنے لگے کہ ان قیدیوں کے ساتھ کیا کیا جائے؟ کسی نے کہا ان کو غلام بنالیا جائے، کسی نے کہا معاوضہ اور زرفدیہ لے کر ان کو آزاد کیا جائے، غرضیکہ ہر کسی نے اپنی اپنی رائے دی۔ آخر کار نبی کریم ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ ان قیدیوں میں سے جو پڑھے لکھے ہیں وہ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو وہ آزاد ہیں اور جن کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا وہ زرفدیہ دے کر آزاد ہو جائیں۔

دیکھیں ایسے عالم میں جب مسلمانوں کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا نبی گرامی اسلام ﷺ نے یہ شرط رکھی کہ جو بھی مسلمانوں کو پڑھائیں وہ بغیر معاوضہ آزاد ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ مشرک قرآن، قرأت اور تجوید تو نہیں سکھائے گا لیکن اس کے باوجود مشرک کو وعدہ دیا گیا کہ مسلمانوں کو تعلیم دے تو وہ آزاد ہے۔ باوجود اس کے کہ پیسہ لینے کا امکان تھا اور وہ خود بھی پیسہ دینے پر مائل تھے لیکن نبی کریم ﷺ نے موقع سے فائدہ اٹھایا تاکہ مسلمان لکھنا پڑھنا سیکھ جائیں۔ آپ ﷺ نے خالی خزانہ اور خالی پیٹ برداشت کیا لیکن مسلمانوں کا ان پڑھ ہونا برداشت نہیں کیا۔ اس واقعہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے تعلیم و تعلّم کو اس قدر اہمیت دی کہ ایسے نازک حالات میں بھی تعلیم و تعلم کو باقی مسائل پر مقدم سمجھا۔

لیکن آج ہماری حالت دیکھیں۔ کتنے والدین ہیں جو بچے کی فیس نہ ہونے کی بناء پر اسے اسکول نہیں بھیجتے۔ آج ہماری یہ حالت ہے کہ بیس فیصد سے بھی کم لوگ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور بیس فیصد وہ لوگ ہیں جو فقط اپنے نام لکھنا جانتے ہیں یا معمولی سا کچھ پڑھ سکتے ہیں یعنی پرائمری، مڈل یا اس سطح کے لوگوں کو شمار کر کے بیس فیصد تعلیم یافتہ بنتے ہیں۔ اس بیس فیصد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ۵ فیصد ہیں۔ متوسط تعلیم یافتہ ۱۰ فیصد ہیں اور باقی ۵ فیصد ابتدائی تعلیم کے لوگ ہیں۔ ایسا ملک جس میں ۸۰ فیصد ان پڑھ لوگ ہیں اس کی دفتری زبان

انگریزی ہے۔اس خواندگی کے عالم میں کہ ۸۰ فیصد لوگ اُردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے انگریزوں نے ہمارے ملک میں جو تحفہ چھوڑا وہ انگریزی ہے۔ ہمارے ملک میں دہشت گردی، کرپشن، لوٹ کھسوٹ، افراتفری اور ہرج ومرج تمام کے تمام ناخواندگی کا نتیجہ ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ ہمارے پاس لکھنے پڑھنے کے وسائل نہیں ہیں، بجٹ نہیں ہے اور حکومتی خزانہ خالی ہے بلکہ ابھی تک ہمارے لئے تعلیم کی اہمیت اجاگر نہیں ہوئی ہے لہٰذا اہم دوسرے کاموں کو ترجیح دیتے ہیں لیکن لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے لئے قدم نہیں اٹھاتے۔

پوری دنیا میں تقریباً ۹۳ فیصد ثروت دنیا کے ۷ فیصد لوگوں کے اختیار اور قبضے میں ہے۔ باقی ۷ فیصد ثروت سے ہم باقی لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پاکستان میں ۵ فیصد لوگ ۹۵ فیصد ثروت پر قابض ہیں جبکہ ۹۵ فیصد محروم لوگ ۵ فیصد امکانات، وسائل اور ثروت پر گزارہ کر رہے ہیں۔

۲۰ فیصد پڑھے لکھے لوگوں میں سے جن کے پاس اچھی تعلیمی سہولتیں فراہم ہیں وہ ۲ فیصد لوگ ہیں۔ ۳ فیصد وہ لوگ ہیں جن کیلئے تعلیم کی اچھی سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ باقی ۱۵ فیصد کے اختیار میں صرف نام کی حد تک تعلیمی سہولتیں فراہم ہیں لیکن اہم نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنا پیٹ کاٹ کر تعلیم پر خرچ کرے تب ہی تعلیمی ماحول بن سکتا ہے۔صدر اسلام میں اس کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ جیسے جنگِ بدر سے پہلے اور بعد میں مسلمانوں کے لئے ایک ایک پائی بڑی اہمیت رکھتی تھی لیکن رسول اللہ ﷺ نے سب کچھ تعلیم پر قربان کر دیا۔

کہاں دینِ مسیحیت کہ جس نے لکھنے، پڑھنے یا علوم کے حصول پر پابندی عائد کی اور کہاں دین اسلام کہ جو اپنا بیت المال تعلیم کے اوپر قربان کر رہا ہے تاکہ مسلمان تعلیم یافتہ ہو جائیں۔ نہ یہ کہ وہ مشرک ان کو قرآن پڑھائیں بلکہ الف، ب اور لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ پس اسلام میں علم و دین کی جنگ کا تصور تک محال ہے۔ تعلیم کی طرف رغبت دلانا اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے۔

اسلام کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اسلام ایک علمی مسلک اور مذہب ہے۔ یہاں تک اسلام نے طبقاتی نظام کو مسترد کیا ہے۔اسلام نے کسی قسم کی طبقاتیت کو قبول نہیں کیا بلکہ پہلے سے موجود طبقاتی نظام کو ختم کر دیا اور آئندہ کے لئے بھی طبقاتیت کا دروازہ بند کر دیا لیکن صرف ایک طبقہ قبول کیا ہے اور وہ یہ ہے:

هَلْ يَسْتَوِی الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ......[1]

کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے یکساں ہو سکتے ہیں......

عالم اور جاہل ایک جیسے نہیں ہیں۔ شاید بعض اوقات جہلاء یہ سمجھ بیٹھیں کہ ہم بھی علماء جیسے ہیں یعنی اَن پڑھ یہ سمجھتا ہے کہ مجھ میں اور پڑھے لکھے میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ وہ بھی کھاتا پیتا ہے اور میں بھی۔ پس جاہل کی بدگمانی، خوش فہمی یا غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے بیان کیا گیا کہ جاہل اور عالم میں بڑا فرق ہے۔

دینی و دنیوی علوم میں حدِ فاصل کا مفروضہ

......دینی و دنیوی علوم میں حدِ فاصل کا مفروضہ

دین، علم اور انسان پر سب سے بڑا ستم یہ ہوا کہ دین اور دنیا میں فرضی سرحد قائم کی گئی کہ یہاں تک دین ہے اور اس کے بعد دنیا، پھر اس کے نتیجے میں علوم کو دینی و دنیوی علوم میں تقسیم کیا گیا۔ یہ سب سے بڑا ستم ہے کہ جو کچھ ہم دینی مدرسے میں بیٹھ کر پڑھیں وہ علمِ دین ہے اور جو کالج و یونیورسٹی میں پڑھیں وہ دنیا ہے! اس چیز نے جتنا نقصان دین اور دنیا دونوں کو پہنچایا ہے کسی دوسری چیز نے نہیں پہنچایا۔ یہ فرضی سرحد جو دین، دنیا اور علوم کے درمیان قائم کر دی گئی ہے اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آج اسلام پڑھنے والے سائنس اور سائنس پڑھنے والے اسلام سے دور ہیں۔ علم اور دین یا اسلامی علوم اور غیر اسلامی علوم کی سرحد قائم کرنا سرے سے غلط ہے یعنی ایک علم کو علمِ دین کہہ کر مدرسہ میں بٹھا دینا اور دوسرے کو علمِ دُنیا کہہ کر کالج میں بٹھا دینا اور پھر دونوں کے درمیان سنتری کھڑا کر دینا کہ وہ ادھر نہیں آ سکتا اور یہ اُدھر نہیں جا سکتا۔ ہمارے ساتھ یہی کام ہوا ہے۔ یہی دردِ اقبالؒ ہے جو اس قوم کے ساتھ ہوا ہے اور آج ہم بھی یہ باور کر چکے ہیں کہ گویا دین اور چیز ہے اور دنیا چیز دیگر۔ اگر علم، تجدد، سیاست، اجتماعیت، حکومت، معیشت، اقتصادیات اور ثقافت وغیرہ کو اسلام سے نکال دیا جائے تو وہی کیلے کا چھلکا رہ جاتا ہے جس

---

[1]......(سورۂ زمر/۹)

کے اصل مواد کو گٹھلی سمجھ کر پھینک دیا جائے اور مدرسہ میں بیٹھ کر چھلکا کھایا جائے۔ یہ اسلام نہیں ہے۔ نہ وہ سائنس دان، سائنس دان ہے جو روحِ اسلام سے بے خبر ہے اور نہ وہ عالم دین، عالم ہے جب تک اس کو جہان سے آشنائی نہ ہو۔ لہٰذا دونوں محروم ہیں اور ہمیں دونوں پر افسوس کرنا چاہئے۔

تمام علوم دینی ہیں اگر انسان ان کو خدا کے لئے حاصل کرے لیکن اگر کوئی اپنے نام و نمود اور شہرت کیلئے قرآن بھی پڑھے تو یہ دینی کام نہیں کر رہا ہے۔ اگر ایک انسان تفسیر قرآن کر رہا ہے لیکن اس میں مقصود فقط اپنی شہرت یا پیسہ کمانا ہو تو دنیاوی کام میں مشغول ہے لیکن اگر ایک انسان فزکس، کیمسٹری، ریاضی، جغرافیہ یا سائنس وغیرہ پڑھ رہا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس علم کے ذریعے انسانیت کو آگاہ کرے تاکہ وہ اپنے لئے بہتر وسائل زندگی تلاش کرے اور ان وسائل زندگی کی مدد سے اپنی تکمیل کرے، اپنے مقصدِ خلقت کو سہولت سے پالے تو یہ انسان ایک دینی عمل انجام دے رہا ہے اور دینی علم پڑھ رہا ہے۔

لہٰذا صدرِ اسلام سے لے کر کئی سو سال تک یعنی آٹھویں ہجری یا اس کے بعد بھی علماءِ دین وہی لوگ تھے جو علوم تجربی، علوم طبعی اور سائنس کے ماہرین تھے۔ اس زمانے میں سائنس دان، علماءِ طبیعت اور علماءِ دین سب ایک تھے جیسے بوعلی سینا، البیرونی، جابر بن حیان، ابن الہیثم، خواجہ نصیرالدین طوسیؒ وغیرہ۔ یہ لوگ علماءِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے سائنس دان بھی تھے مثلاً ابن سینا کی طب، فلسفہ الٰہیات اور اخلاقیات وغیرہ کی کتابیں اب بھی مدرک وسند کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اسی طرح خواجہ نصیرالدین طوسیؒ نے فلسفہ، منطق، کلام، ریاضی، علم ہیئت اور علم ہندسہ میں جو کام کیا اس کی مثال آج تک نہیں ملتی۔ وہ لوگ جو ریاضیات سے آشنا ہیں جانتے ہیں کہ ریاضیات عالیہ میں خواجہ نصیر الدینؒ کے نظریات کا کس قدر مقام ہے۔ خواجہ نصیرالدینؒ اختر شناسی کے ماہرین میں سے تھے۔ انہوں نے ایران کے مغربی شہر تبریز کے قریب مراغہ کے مقام پر ایک رصدخانہ قائم کیا تھا جس کے آثار آج بھی باقی ہیں۔

خود خواجہ طوسیؒ کے شاگردوں میں اکثریت اہل سنت کے علماء کی ہے یعنی اس دور میں یہ تمیز نہیں ہوتی تھی جو آج کل علمی ماحول میں موجود ہے۔ اس دور میں علماء اسلام یعنی شیعہ اور سنی مل بیٹھ کر کام کرتے تھے، ایک

دوسرے کے شاگرد اور استاد ہوتے تھے مثلاً ملاعلی قوشجی جو فاضل قوشجی کے نام سے مشہور ہیں خواجہ نصیرالدین طوسیؒ کے شاگرد ہیں۔خواجہ نصیرالدین طوسیؒ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے جبکہ ملاعلی قوشجی اہل سنت میں سے تھے۔فاضل قوشجی نے اپنے استاد طوسیؒ کی بعض کتابوں پر شرح بھی لکھی ہیں مثلاً کتاب تجرید الاعتقاد پر ملاعلی قوشجی کی شرح بہت مشہور ہے۔یہ استاد وشاگرد مدت مدید تک ایک ہی رصد خانہ میں بیٹھ کر رصد خانہ چلاتے رہے۔ان کی لکھی ہوئی کتب آج بھی رصد خانوں میں ایک معیار سمجھی جاتی ہیں۔ان کے محاسبات کے مطابق آج بھی تقویم اور ہر سال کے کیلنڈر تیار کئے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ بیسیوں نمونے اور بھی موجود ہیں۔

درحقیقت اس زمانے میں ماحول یہ بن گیا تھا کہ جب تک کوئی شخص اپنے آپ کو ایک جامع علمی شخصیت نہ بنالیتا اس کی علمیت کا کوئی قائل نہیں ہوتا تھا۔اگر کوئی کسی خاص شعبہ میں معلومات رکھتا تھا تو اس کو دانشمند یا دانشور نہیں سمجھا جاتا تھا۔

......حقیقی عالم کون؟

اسلام نے عالم کا ایک تصور پیش کیا ہے جس سے حقیقی عالم کی پہچان ہوتی ہے۔قرآن کریم نے عالم کی تعریف یوں کی ہے:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ......[1]

اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی اس سے ڈرتے ہیں......

عالم اسے نہیں کہتے جس کے پاس ڈگری ہو، جس نے عالمانہ لباس پہنا ہوا ہو، جو مسجد یا مدرسہ میں بیٹھا ہوا ہو یا جو چند علمی اصطلاحات یاد کر کے عالمانہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہو اور ادیبانہ باتیں کرتا ہو۔یہ عالم نہیں بلکہ یہ کام تو ایک ریکارڈر بھی کرسکتا ہے۔

---

[1]......(سورۂ فاطر/۲۸)

قرآنِ کریم کے بتائے ہوئے معیار کے مطابق عالم وہ ہے جس کے اندر خوفِ خدا ہو لہٰذا جس کے اندر خوف خدا نہیں، جو انسان کے اندر خوفِ خدا پیدا نہ کر سکے وہ سرے سے عالم ہی نہیں ہے۔

دوسرے مقام پر قرآنِ کریم میں آیا ہے:

الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسَالَاتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ......[1]

جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے......

جو لوگ تبلیغ رسالت و تبلیغ دین کرتے ہیں، جو مبلغینِ پیغامِ خدا ہیں ان کی خصوصیت یہ ہے کہ سوائے خدائے متعال کے کسی سے نہیں ڈرتے۔ یعنی علم کا لازمہ یہ ہے کہ انسان کے اندر خوف خدا آجاتا ہے۔ اور خوف خدا کا لازمہ یہ ہے کہ پھر وہ انسان غیر اللہ سے نہیں ڈرتا۔ جو خدا کے علاوہ کسی شے سے ڈر جائے تو معلوم ہوا کہ اس کے اندر خوفِ خدا نہیں، جہاں خوف خدا نہ ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں علم نہیں۔ ویسے ہی ہم نے ان کو عالم سمجھا تھا در حقیقت وہاں علم نامی کوئی شے موجود نہیں ہے۔

اس لئے کہ قرآن نے عالم ربانی کا معیار خوفِ خدا قرار دیا ہے۔ عالم ربانی کا حلیہ بیان کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَO......[2]

کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ تو اسے کتاب، حکمت اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے: اللہ کی بجائے میرے بندے بن جاؤ بلکہ (وہ تو یہ کہے گا:) جو تم (اللہ کی) کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور جو کچھ پڑھاتے ہو اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم ربانی بن جاؤ۔

جو شخص انسان کو اپنی طرف بلاتا ہو، جو اپنے چرچے اور اپنے قصے لوگوں کی زبان سے سننے کا عادی

---

[1]......(سورۃ الاحزاب/۳۹) [2]......(سورۂ آلِ عمران/۷۹)

ہو کہ لوگ میری تعریف کریں، واہ واہ کریں، وہ عالم نہیں ہے بلکہ عالمِ ربانی وہ ہے جو لوگوں سے کہے کہ ...... كُونُوا رَبَّانِيِّينَ ......یعنی تم ربانی بن جاؤ۔

......اسلام کی علم دوستی

سکیولرازم کی پیدائش کے لئے دین کی علم دشمنی شرطِ اول ہے جیسا کہ دین مسیحیت میں یہ شرط پائی جاتی تھی، لیکن دین اسلام میں یہ شرط مفقود ہے۔ جو دین علم کی ترویج وترغیب پر استوار ہے، جس کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ لوگوں کو علم کی طرف دعوت دیتا ہے، جو جاہل کے لئے کسی قسم کی فضیلت کا قائل نہیں ہے تو اس مذہب کے اندر سکیولر تحریک کیسے جنم لے گی۔ ایسا مذہب جو جدید انکشافات اور جدید ٹیکنالوجی کی طرف رغبت دلاتا ہے اس کے اندر سکیولر یہ نعرہ کیسے بلند کر سکے گا کہ یہ مذہب، سائنس، جدید انکشافات، ایجادات اور ترقی کا مخالف ہے!

یہ مذہب تو خود کہتا ہے کہ آؤ انکشافات کرو، بہترین زندگی کی طرف قدم بڑھاؤ، زمین میں موجودہ اشیاء سے فائدہ اٹھاؤ۔ خصوصاً قرآن کریم کو کھول کر دیکھیں تو جو آیات یہ کہتی ہیں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، حج کرو، زکوٰۃ دو وہ پانچ سو سے زیادہ آیات نہیں بنتیں درحالیکہ قرآن کریم میں پانچ ہزار ایسی آیات ہیں جو انسان کو بتاتی ہیں کہ زمین کیا ہے، زمین کے اندر اور باہر کیا رکھا ہوا ہے، زمین سے فائدہ کیسے اٹھایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح بہت سارے انکشافات اور قوانین کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سورج، چاند، پہاڑ اور ستاروں کا بار بار تذکرہ آیا ہے حتیٰ کہ قرآنی سورتوں کے نام دیکھیں۔ کسی بھی سورت کا نام سورۃ الصلوٰۃ، سورۃ الصوم یا سورۃ الزکوٰۃ نہیں ہے بلکہ قرآنی سورتوں کو طبعی اشیاء کے نام سے موسوم کیا گیا ہے مثلاً سوۃ الشّمس، سورۃ القمر، سورۃ الانسان اور سورۃ البقرہ وغیرہ۔

یہ اہتمام اس وجہ سے ہے کہ یہ ساری چیزیں جاننے سے تعلق رکھتی ہیں۔ سورۃ الانسان، سورۃ البقرہ، سورۃ النمل، سورۃ العنکبوت اور سورۃ النحل کو پڑھیں اور ان کے وجوہات میں رموز واسرار سے واقف ہو جائیں۔

اسلام کی علم دوستی

ان اشیاء کے نام سے قرآنی سوروں کو موسوم کرنا اس اہتمام کی طرف اشارہ ہے کہ انسان ان سے غافل نہ رہے بلکہ ان کے متعلق معلومات حاصل کرے۔

قرآن کریم میں زمین کا تذکرہ بار بار آیا ہے مثلاً اسی ایک آیت کی طرف توجہ فرمائیں:

سِیْرُوْا فِی الْأَرْضِ......[1]

تم زمین میں سیر کرو، زمین میں گھومو، زمین میں جا کر مطالعہ کرو،

فَانْظُرُوْا......

اس کا مطلب یہ نہیں کہ گھر سے نکل کر کسی افق کی طرف دیکھو بلکہ زمین کا مطالعہ کرو۔

یہ زمین جو تمہارے لئے مہد اور گہوارہ قرار دے گئی ہے:

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًاo......[2]

کیا ہم نے زمین کو گہوارہ نہیں بنایا؟!

اپنا گہوارہ کھول کر دیکھو۔ اس میں تمہاری زندگی کا سب ساز وسامان رکھا ہوا ہے۔ اس کو کھود و، اس میں ہل چلاؤ، معدنیات نکالو، جدید قوانین کشف کرو، وسائل زندگی پیدا کرو ''سِیْرُوْا، فَانْظُرُوْا'' پر عمل اس وقت ہوتا ہے، ورنہ ایک آدمی بس پر بیٹھ کر ساری زمین گھوم آئے اور کہہ دے کہ میں نے سِیْرُوْا فِی الْأَرْضِ پر عمل کیا ہے؟! اس سے مراد ٹورازم نہیں، یوں نہیں کہ ٹورسٹ کمپنیز اپنے دفاتر کے اوپر سِیْرُوْا فِی الْأَرْضِ لکھ دیں اور ٹرانسپورٹ کمپنی بنا کر بسیں چلانا شروع کریں بلکہ اس کا معنٰی یہ ہے کہ کسی تحقیقاتی لیبارٹری کے اوپر...... سِیْرُوْا فِی الْأَرْضِ...... لکھو اور یہی گردش درزمین ہے۔

لہٰذا جس دین کے اندر علم دشمنی کی بجائے ''علم دوستی'' موجود ہے اس دین کے اندر سکیولر تحریک چلانا کیسے ممکن ہے؟!!

---

[1]......(سورة الانعام/١١)(سورة النمل/٦٩)(سورة العنكبوت/٢٠)(سورة الروم/٤٢)　[2]......(سورة النبا/٦)

5- کلیسا کے اندر فسادات

سکیولرازم کی پیدائش میں سب سے بڑا کردار علماءِ مسیحیت کے اندر فساد (خصوصاً مالی و اخلاقی) فساد نے ادا کیا۔ بنی اسرائیل، کلیسا کے ارباب اور علماء کا فساد زدہ ہونا باعث بنا کہ لوگ دین سے برگشتہ ہوئے اور سکیولرازم کی پیدائش کے لئے میدان فراہم ہوا۔ سکیولرازم نے ایک مرحلہ میں علماء دین کے خلاف چلنے والی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔

......کلیسا میں مالی فساد

مالی فساد سب سے بڑا فساد ہے۔ بہت سارے لوگ طہارت اور نجاست میں بہت احتیاط کرتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ نالی سے کوئی چھینٹ ان کے دامن پر نہ آ لگے لیکن مالِ حرام کھانے سے نہیں جھجکتے۔ درحالیکہ مالِ حرام اس نالی کے چھینٹے سے کہیں زیادہ نجس ہے۔ اگر گندی نالی سے ایک قطرہ اڑ کے لباس پر پڑ بھی جائے تو فقط لباس نجس ہوتا ہے جبکہ مالِ حرام کھانے سے انسان کی روح نجس ہو جاتی ہے۔

بنی اسرائیل اور کلیسا کے ارباب اس پلیدی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ہر بہانے سے لوگوں کا مال ہتھیانا ان کا شیوۂ زندگی بن چکا تھا۔ قرآن کریم نے بھی ان کی اس بری صفت کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ......[1]

اے ایمان والو! (اہلِ کتاب کے) بہت سے علماء اور راہب، لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور انہیں راہِ خدا سے روکتے ہیں......

انہوں نے اپنے عیش وعشرت کے لئے لوگوں کا سرمایہ لوٹنا شروع کیا۔ اس کام کیلئے انہوں نے بہت

---

[1]......(سورۃالتوبۃ/ ٣٤)

خوبصورت حیلہ بنایا اور وہ یہ تھا کہ انہوں نے مغفرت نامے پرنٹ کروا کر لوگوں میں تقسیم کروائے۔ان کا کہنا تھا کہ کلیسا کا بجٹ ختم ہوگیا ہے لہٰذا تدبیر سوچی اور لوگوں میں بھاری قیمت پر مغفرت نامہ بیچ کر ان سے پیسہ نکلوایا۔یہ بھی لکھا گیا ہے کہ پورے یورپ میں منادی کروائی گئی تاکہ لوگ آکر مغفرت نامے لے لیں۔یہاں تک کہ عورتوں نے اپنے زیورات بیچ بیچ کر مغفرت نامے خریدے حالانکہ خواتین ہر چیز حتیٰ کہ شوہر کی حیثیت، آبرو اور عزت تک بیچ کر زیورات خریدتی ہیں لیکن ان کو مغفرت نامہ اتنا عزیز ہوتا تھا کہ اپنا زیور تک بیچ کر اسے خریدتی تھیں اور مردوں نے بھی املاک، مکان اور زمینیں بیچ کر مغفرت نامے خرید لئے۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ پاپ نے سن ۱۳۰۰ء مغفرت اور بخشش کا سال قرار دیا اور اس سال مغفرت کا جشن منایا۔ان کے مطابق جن لوگوں نے اس جشن میں شرکت کی وہ سب کے سب بخش دئے گئے۔اس طریقے سے بہت بڑی رقم کلیسا کے ہاتھ آئی۔پہلے ان کا ارادہ تھا کہ ہر سو سال بعد مغفرت کا جشن منائیں لیکن جب دیکھا کہ اس کے بہت زیادہ مالی فائدے ہیں تو انہوں نے اعلان کیا کہ ہر پچاس سال بعد جشنِ مغفرت منائیں گے پھر پچیس سال کا اعلان کیا۔اسی طرح سال کم کرتے رہے اور اپنے مغفرت نامے بیچتے رہے۔اسی طرح پاپ نے ٹیمپلرز (Templers) فرقہ کالعدم قرار دیا اور ان کی جائداد، اموال واملاک کو لوٹ لیا۔

اس کے علاوہ کلیسا نے چودھویں صدی میں لوگوں سے مال ودولت اکٹھا کرنے کے لئے خاص قوانین اور فاؤنڈیشنز قائم کی تھیں مثلاً مغفرت نامے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے آزادی دلانے کی فیس، گناہوں کے اعتراف، شادی اور سوگواری کے مختلف مالیات سسٹم وغیرہ۔وہ لوگوں سے زبردستی مالیات اور ٹیکس لیتے تھے۔انہوں نے کروڑوں کی تعداد میں مغفرت نامے بیچ ڈالے اور ہر مغفرت نامہ کی مدت مقرر کردی گئی۔بعض کو چھ مہینہ کا مغفرت نامہ ملتا تھا اور بعض کو ایک سال کا جسے پھر دوبارہ ہر سال یا چھ ماہ بعد رینیو (Renew) کرانا ہوتا تھا۔

اس طرح کلیسا کے اندر ایک بہت بڑا مالی فساد آگیا۔یہ دوسروں کو زہد اور ترکِ دنیا کی رغبت دلاتے تھے جبکہ خود بہت بڑے مالی فساد میں گھرے ہوئے تھے۔یہاں تک کلیسا سے مربوط ایک عام آدمی کی زندگی

بڑی مجلل اور شان وشوکت والی ہوتی تھی۔ واضح بات ہے کہ یہ حربہ ایک مدت تک کامیاب رہ سکتا ہے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ انہوں نے دین کو ذریعۂ معاش بنالیا ہے اور سیاہ دھندے کررہے ہیں تو آخرکار لوگ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ یہ لوگ جو مغفرت نامے تقسیم کرتے ہیں، معلوم نہیں ان کی بھی مغفرت ہوگی یا نہیں؟ ان کے دیئے ہوئے مغفرت نامے جو ہم لے کر چومتے ہیں، سروں پر لگاتے ہیں، فریم کر کے گھروں میں لٹکاتے ہیں، آخر سوچنے کی بات ہے کہ یہ لوگ جو کام خود کررہے ہیں انہیں کون بخشے گا؟!

لوگوں نے ہوش سے کام لیا اور کلیسا کے مخالف ہوگئے۔ انہوں نے کلیسا کو معاشرے سے نکال کر باہر پھینک دیا اور ساتھ ہی دین سے بھی اتنے متنفر ہوگئے کہ کہا ہمیں اس دین کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح انہوں نے سکیولرازم کی پناہ لے لی۔

......کلیسا میں اخلاقی فساد

کلیسا کے ارباب اور علماء کا اخلاقی فساد ان کے مالی فساد سے کم نہیں تھا۔ دوسروں کو شادی نہ کرنے کی تلقین کرتے تھے اور خود وہ کام کرتے تھے جو نہیں کرنے چاہئیں۔ اس اخلاقی فساد نے پورے کلیسا کو گھیرے میں لے لیا۔ اس طرح بدکردار علماء دین نے اپنی بدکرداری اور پلیدگی سے سکیولرازم کے لئے میدان فراہم کیا۔

کلیسا کا اخلاقی فساد کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اس وقت خاص کر امریکہ میں یہ اخلاقی فساد اس قدر عام ہوگیا ہے کہ لوگ جتنا پادری سے ڈرتے ہیں اتنا کسی سے نہیں ڈرتے۔ یعنی جتنا اخلاقی فساد ایک پاپ میں ہے کسی میں نہیں ہے۔ لوگ پادری کو دیکھ وحشت زدہ ہوجاتے ہیں۔ آئے دن پاپ کا کوئی نہ کوئی اسکینڈل (Scandal) سامنے آجاتا ہے۔ میڈیا دیکھیں تو بات سمجھ میں آئے گی۔ خلاصہ یہ کہ مالی اور اخلاقی فساد کا جو نامشروع فرزند متولد ہوا وہ سکیولرازم ہے۔

......اسلام میں علماء کا کردار

الحمدللہ! دامنِ اسلام جیسا کہ دیگر تمام جہات سے غنی ہے اس اعتبار سے بھی مسیحیت سے ممتاز ہے کہ علماءِ اسلام کا کردار نہایت پاکیزہ، صاف ستھرا اور زاہدانہ رہا ہے۔ ہمارے بزرگ علماء اور مجتہدین میں ایسے نمونے ہیں جو تالی تلو معصوم ہیں۔ ان کی زاہدانہ زندگیاں تمام مسلمانوں کے لئے نمونہ ہیں۔ ہمارے مذہب میں ایسے علماء کی تعداد کم نہیں ہے مثلاً شیخ مفیدؒ، شیخ طوسیؒ، سید مرتضٰی علم الھدیٰؒ وغیرہ سے لے کر امام خمینیؒ تک ایسی ہستیاں موجود رہی ہیں کہ جو پیغمبرانہ زندگیاں بسر کر کے دوسروں کے لئے اُسوۂ زہد وتقویٰ رہ چکی ہیں۔

علماءِ اسلام کے لبادے میں ایک دو بد کردار بھی ہو سکتے ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ ان ہی ایک دو کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے لیکن سو با کردار ہوں تو ان کا کوئی نام تک نہیں لیتا۔ سو میں سے اگر ایک کی عباء وقباء کا رنگ تھوڑا اڑ گیا ہوا یا دامنِ عباء تر ہے تو پوری دنیا میں چرچا ہو جاتا ہے لیکن اگر ننانوے پاک و پاکیزہ کردار والے ہیں تو ان کا نام بھی لوگوں کو نہیں بتاتے کہ یہ بھی یہاں رہتے ہیں۔

اسلام کے دامن میں ایسے علماء کثرت سے پائے جاتے ہیں جو تالی تلو عصمت ہیں یعنی معصوم تو نہیں ہیں لیکن عصمت سے زیادہ فاصلے پر بھی نہیں ہیں۔ یوں نہیں کہ معصومین علیہم السلام سے بہت دور فاصلہ پر کھڑے ہوئے ہوں۔ ایسے علماء ہیں کہ جن کی زندگی میں ایک مکروہ تک تلاش نہیں کر سکتے یعنی حرام تو دور کی بات پوری زندگی میں ایک مکروہ کام بھی نہیں کیا۔ گناہ ہمارے کلچر کا حصہ بن چکا ہے اس وجہ سے ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان مکروہ کام بھی نہ کرے۔ لیکن وہ جن کی اپنی جدا ثقافت ہے جو ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت سے لی گئی ہے اس میں مکروہ فعل کا انجام نہ دینا معمول کی بات ہے۔ چرچ والا ماحول اسلام کے اندر نہیں ہے کہ پاپ سے لے کر نچلی سطح تک سب کے سب فاسد ہوں۔

............جھلاء کو علماء کی شکل میں پیش کرنا

علماء دین اور متدینین کو خیال رکھنا چاہئے کہ اسلام دشمنوں نے بعض لوگوں کو علماء کی شکل میں سامنے لاکر سکیولرازم کے لئے میدان فراہم کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ لہٰذا مجھ جیسے طالب علموں کو کہ جولباس روحانیت پہنتے ہیں بہت احتیاط سے قدم رکھنا چاہئے۔

اِذَا فَسَدَ الْعَالِمُ فَسَدَ الْعَالَمُ......[1]

ایک عالم کے فساد سے پوری دنیا فاسد ہوجاتی ہے۔ یہاں ایک غلطی، ایک غلطی نہیں ہوتی بلکہ بہت بڑی بڑی غلطیاں بن جاتی ہیں۔ اس لباس میں ایک معمولی سی غلطی سے ممکن ہے لوگ دین کی نسبت بے رغبت، بدظن اور بدگمان ہوجائیں۔ جس طرح پاپ کی بدکرداری سے لوگ دین سے بیزار ہوگئے۔

اسلام اگرچہ اجتماعی، عقلانی اور علم دوست دین ہے لیکن اگر اسی دین کو ایک برے کریکٹر (Character) کے ساتھ پیش کیا جائے تو ممکن ہے کہ لوگ اس بہترین دین سے نفرت کرنے لگیں۔

سکیولر ماحول پیدا کرنے کیلئے بہترین حربہ اور طریقہ یہی ہے کہ بدکردار لوگوں کو سامنے لایا جائے، ان کو علماء، زعماء اور بزرگان ملت کے طور پر متعارف کروایا جائے تا کہ ان کے کردار دیکھ کر لوگ خود بخود دین سے برگشتہ ہوجائیں۔ اسلام کے دشمنوں نے ایسا ہی کیا۔ جان بوجھ کر کمزور کریکٹر والے افراد کو سامنے لایا گیا۔ ہر روز ان کی زندگی کے سکینڈل سامنے لاکر کہتے ہیں کہ یہ دین ہے، یہ اسلام ہے، دیکھیں انہوں نے کیا کیا؟ مثلاً افغانستان میں جاکر پہلے سے تیار Scenario کے مطابق کام شروع کیا اور آخر کار جو نتیجہ لینا چاہتے تھے لے لیا۔

اگر انٹرنیشنل چینلز مثلاً CNN یا BBC وغیرہ سے کہا جائے کہ ہمارے ہاں ایک تربیتی پروگرام، ایک علمی سیمینار ہورہا ہے لہٰذا صرف پانچ منٹ کے لئے آئیں اور اس کی رپورٹ تیار کرکے نشر کریں، ہم آپ

---

[1]......(الجهاد الأكبر-امام خمینیؒ)(المسجد فی فکر الامام الخمینیؒ)(صحیفۂ نور- امام خمینیؒ)

کو اتنا پیسہ بھی دیں گے لیکن کیا وہ آئیں گے؟ اگر یہ پروگرام بنا کر دکھانے ہوتے تو ابھی تک دکھا چکے ہوتے۔

ہمارے معاشرے میں پڑھی لکھی، پاکیزہ اور باکردار خواتین بھی موجود ہیں لیکن ان کے انٹرویو نہیں لیتے کہ ان کی اولاد کی تربیت کا اندازہ دنیا میں منعکس کریں۔ وہ یہ کام اس لئے نہیں کرتے کیونکہ اس کام سے انہیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ جبکہ افغانستان میں کیمرے لے کر گلی گلی گھوم رہے ہیں۔ دور دراز کسی گاؤں میں ایک پیش نماز کی زبان سے کوئی غلط بات نکلتی ہے فوراً کیمرے لے کر فلم بناتے ہیں اور دنیا میں تشہیر کرتے ہیں یا ایک پرائمری اسکول میں ایک بچے کو استاد نے تھپڑ مار دیا تو فوراً فلم بنا کے دکھاتے ہیں۔ ماجرا کیا ہے؟ ایک پیش نماز یا پرائمری کے استاد کی اتنی اہمیت ہوگئی؟! حقیقت یہ ہے کہ سکیولرازم کا میدان فراہم کرنے کے لئے انہوں نے یہ کام افغانستان سے شروع کیا۔ پہلے ایک طبقہ بنا کر سامنے لائے پھر ان کے اعمال پر کڑی نظر رکھی، ان کے اعمال کو فلمایا، خبریں اور رپورٹز تیار کیں پھر کہا کہ دیکھو یہ اسلام کے علماء ہیں۔ یہ کیا کام کر رہے ہیں؟ یہ قینچیاں لے کر ناپ ناپ کر لوگوں کی داڑھیاں کٹواتے ہیں، یہ لوگوں کے پائنچے کٹواتے ہیں۔ انہوں نے جو ظلم وستم روا رکھا اور زندہ انسانوں کو پکڑ کے بکریوں کی طرح ذبح کیا یہ سارے کرتوت فلمیں بنا بنا کر دنیا کے سامنے پیش کئے گئے۔

یہ انٹرنیشنل چینلز حضرت امام خمینیؒ جیسی شخصیات کی دستاویزی فلمیں کیوں نہیں بناتے کہ اس شخص کی عائلی زندگی، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، باتیں، افکار ونظریات، گھریلو تعلقات، تدبیر مملکت اور سیاست کیسی تھی؟ جبکہ افغانستان میں ایک چھوٹے سے پیش نماز کی تمام تر افراطی حرکات کی فلم بنا کر پیش کرتے ہیں۔

عالمی استعمار واستکبار افغانستان میں دہشتگرد گروہ کو پروان چڑھا کر منظر عام پر لائے جس نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا اور پھر آ کر اپنے اس دہشت گرد گروہ کو مزید قتل عام کر کے ہٹا دیا۔ ہم خوش ہو گئے کہ ہم بچ گئے لیکن یہ جو ہمارے عزیز ورشتہ داران دہشت گردوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے ان کا قاتل کون ہے؟ لہٰذا ایک خاص گروہ کے ذریعے قتل عام کروا کے پھر اس کی فلمیں بنوا کر ساری دنیا میں دکھائیں اور کہا کہ یہ علماءِ اسلام ہیں۔ مسیحیوں نے جب یہ فلمیں دیکھیں تو کہا کہ پاپ تو ان سے ہزار درجے بہتر ہے۔

یہ ایک مصنوعی کھیل تھا جو انہوں نے اسلامی سرزمین میں آ کر کھیلا۔ دہشت گرد گروہ کو خود ہی بنایا اور اس پر پانی کی طرح پیسہ بہایا۔ ورنہ اسلام تو ایسی افراطی حرکات سے ہمیشہ منع کرتا ہے۔ اسلام کے دامن میں صلح پسند، امن پسند، متقی و پرہیز گار علماء کا کردار سب کے لئے روشن ہیں لیکن عوام کی یہ کمزوری ہوتی ہے کہ ہم تھوڑا اونچا سنتے ہیں۔ جو کام کی بات ہو وہ آرام سے سنتے ہیں لیکن جو کام کی نہ ہو اس کو ذرا اونچا سنتے ہیں۔ سو با کردار ہوں لیکن ہماری نظریں ایک دو بدکرداروں پر جا کر لگتی ہیں۔ اپنی محفلوں میں صبح و شام ان بدکرداروں کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں تو دنیا بھی یہی سمجھے گی کہ ان کے پاس یہی ہیں۔

ہم اپنی محفلوں میں ان با کردار علماء کا تذکرہ کیوں نہیں کرتے جنہوں نے اسلام کی خاطر سب کچھ قربان کر دیا ہے اور آخر کار خود اپنے خون کا نذرانہ پیش کر کے شہید ہو گئے۔ تاریخ میں علماء امامیہ کا کردار دیکھیں۔ ڈاکٹر شریعتی نے کہا ہے کہ میں نے آج تک کسی ایسے قرارداد کے نیچے کہ جس میں ملک وملت اور دین کے ساتھ خیانت کی گئی ہو، کسی عالم دین کا دستخط نہیں دیکھا۔ ذلت و رسوائی، وطن فروشی اور عزت فروشی کی تمام ننگ آور قراردادوں کے نیچے کسی روشن فکر کے دستخط ہوتے ہیں۔ کسی عالم دین نے ابھی تک مملکت، وطن اور ملت کو نہیں بیچا بلکہ ہمیشہ ان کو بچایا ہے۔

خلاصہ یہ کہ سکیولرازم کے لئے جو ماحول چاہئے تھا وہ یہ تھا کہ عقل و دین میں نبرد ہو، علم و دین کی جنگ ہو، دین و دنیا میں جدال ہو اور سب سے بڑھ کر علماء دین بدکردار ہوں۔ یہ سکیولرازم کی پیدائش کے لئے ضروری عناصر ہیں۔ یہ کھیت اور کھاد ہو گی تو سکیولرازم جنم لے گا۔ لیکن اسلام کے اندر ان عناصر میں سے ایک عنصر بھی نہیں پایا جاتا لہٰذا اسلام کے ساتھ سکیولرازم سازگار نہیں اور نہ ہی اسلام سکیولرازم کو برداشت کر سکتا ہے۔

البتہ مسلمانوں کی بات الگ ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے اندر نہ تو اسلامی تہذیب ہے نہ کلچر اور نہ ہی ان کا اسلام سے کوئی تعلق ہے بلکہ بہت فاصلے پر ہیں۔ ان کا نام مسلمان اس لئے پڑ گیا ہے کہ تین وقت انہوں نے اسلامی رسومات انجام دی ہوں۔ پیدائش کے وقت ان کے کان میں اذان ہوئی، نکاح کے وقت ان کا اسلامی طریقے سے نکاح پڑھا گیا اور مرتے وقت ان کا جنازہ پڑھا گیا ہے لہٰذا اگر سکیولر مسلمان مل جائیں

تو وہ ایسے مسلمان ہیں۔

پس اسلام میں سکیولرازم کیلئے مصنوعی طور پر مسیحیت کی طرح طبعی ماحول پیدا کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔فرقہ واریت، دشمنیوں اور قتل وغارت کا یہ سارا کھیل اسلام میں سکیولرازم لانے کے لئے کھیلا جا رہا ہے۔

......اسلام دہشت گردوں کے نرغے میں

آج اسلام اور مسلمان دونوں دہشت گردوں کے نرغے میں ہیں۔ہمیں توجہ اور ہوشیاری کی ضرورت ہے ورنہ ٹیکنالوجی سے پُر اس پیچیدہ زمانے میں اگر غفلت اور سادگی اختیار کی تو یہ زمانہ ہمیں نگل جائے گا۔ یہ اہل زمانہ بڑے ہی بے رحم اور سنگدل ہیں۔

سوچنے کی ضرورت ہے کہ جو کچھ ظاہر میں ہو رہا ہے مثلاً یہ دھماکے، قتل عام، مساجد اور امام بارگاہوں میں بے گناہ نمازیوں کے خون سے کھیلنا، یہ سب کیوں ہے؟ سوچیں کہ یہ کڑیاں آپس میں کیسے ملتی ہیں؟ سکیولرازم کی تحریک آج کل زوروں پر ہے اور اس میں اچانک حرکت کیوں آئی ہے جبکہ پہلے بہت سست تھی۔ اس لئے کہ انہوں نے انقلابِ اسلامی ایران کے کامیاب ہونے سے پہلے یہ سوچا تھا کہ اسلام طبعی طور پر خود بخود آہستہ آہستہ مسیحیت کی سرنوشت سے دوچار ہوگا لہٰذا ہمیں اتنی تگ و دو کی ضرورت نہیں۔مسلمانوں میں جو کمزوریاں ہیں یا ہم نے جو کچھ کیا ہے اس سے اسلام خود ہی مسیحیت کی حد تک چلا جائے گا لیکن جب انقلابِ اسلامی ایران کامیابی سے ہمکنار ہوا یعنی انہوں نے دیکھا کہ اسلام کے نام پر ایک تحول اور تبدیلی آئی، لوگوں نے مذہب کے نام پر ظلم وستم کے خلاف سر اٹھایا جبکہ مسیحیت تو ظلم پزیری کا درس دے رہا تھا تو یہاں سے ان کو اسلام اور مسیحیت میں فرق نظر آیا۔مسیحیت کا درس یہ تھا کہ اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر مارے تو بائیں گال کو خود ہی آگے کر دو جبکہ اسلام نے کہا کہ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر مارے تو تم اس کے دونوں گال سرخ کر دو۔ یہ فرق انہیں پہلی دفعہ نظر آیا۔

پھر انہوں نے یہ فرق بھی دیکھا کہ پاپ ایک ایسا انسان ہے جس کا کوئی ارادہ، قوت، طاقت

اور فیصلہ عوام پر اثر انداز نہیں ہوتا، وہ جو بھی کہتا رہے لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں لیکن اسلام کے ایک مرجع عالی و مجتہد کے ایک جنبش لب پر کس قدر لوگ جان دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے جب اسلام کی طاقت کا یہ مظاہرہ دیکھا تو سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ہم نے پہلے جو اسلام سمجھا ہوا تھا وہ محاسبات یکسر غلط ثابت ہوئے۔ اب آگے کچھ اور تدبیر کرنی چاہئے۔ انقلابِ اسلامی کی کامیابی سے اسلام نے مسلمانوں کو بیدار کیا ہو یا نہیں لیکن دشمن ضرور بیدار ہو گیا ہے۔

بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ ہم ان کے ذریعے اپنے دوستوں کو جگانا چاہتے ہیں لیکن دشمن جاگ جاتے ہیں۔ مثلاً آپ اپنے سوئے ہوئے دوست کو اٹھانے کیلئے اتنا زور زور سے بولیں کہ ہمسایہ جاگ پڑے لیکن وہ نہ جاگے۔ مسلمانوں کے ساتھ یہی ہوا۔ ہمیں جھنجھوڑا گیا لیکن ہم نہیں جاگے بلکہ ہمسایہ جاگ پڑا۔ اس کو پتا چل گیا کہ اس گھر میں کوئی آیا ہے اور بیدار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

لہٰذا انقلابِ اسلامی ایران کی کامیابی سے اسلام کے دشمن جاگ اٹھے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ پہلے ہماری سوچ غلط تھی۔ اسلام تو مسیحیت کا نقطۂ مقابل بن گیا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ مسیحیت کی سرنوشت سے اسلام خود ہی دوچار ہو جائے گا لیکن یہاں تو معاملہ برعکس ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسلام کی دیکھا دیکھی مسیحیت دوبارہ سر اٹھائے اور لوگ پھر سے دین کی طرف راغب ہو جائیں۔

انقلابِ اسلامی ایران اسلام کی قوت کی ایک جھلک تھی اور ایک چھوٹا سا نمونہ تھا۔ ان کی سوچ اس نقطہ پر آ کر گہری اور عمیق ہوئی کہ ہم نے دو کام کرنے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں کو اندر سے کھوکھلا کرنا ہے۔ دوسرا کام یہ کہ اگر مسلمانوں کو ہم ختم بھی کر دیں تو اسلام کی طاقت ہمیشہ خطرے کے طور پر رہے گی لہٰذا ان سے اسلام کی قوت بھی چھین لی جائے تاکہ کبھی بھی کوئی نسل اس سے فائدہ نہ اٹھائے۔

پس انہوں نے دو قسم کی دہشت گردی شروع کی۔ ایک دہشت گردی مسلمانوں کے خلاف شروع کی کہ مساجد، امام بارگاہوں اور دینی مدارس پر حملے و دھماکے شروع کروائے۔

جبکہ دوسری سنگین ترین دہشت گردی خود اسلام کے خلاف شروع کی۔ سیکولرازم اور لائیک ازم

اسلام دہشت گردوں کے نرغے میں

(Secularism & Laicism)اسلام کے خلاف دہشت گردیاں ہیں۔ دہشت گرد کون ہیں؟ مسلمانوں کا دہشت گرد کون ہے اور اسلام کا دہشت گرد کون ہے؟ دہشت گرد سب کو معلوم ہیں لیکن جب خود ایک دہشت گرد، دہشت گرد دہشت گرد... کہنا شروع کرے تو دہشت گرد محفوظ ہو جاتے ہیں، چھپ جاتے ہیں جیسا کہ جب چور خود ہی چور، چور کے نعرے لگانا شروع کرے تو چور لوگوں میں چھپ جائے گا لہٰذا دہشت گرد، دہشت گرد کہنے والے حقیقت میں اپنی حفاظت کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ابھی دہشت گرد پکڑے جائیں گے اور امن وامان قائم ہوگا۔

مسلمانوں کا دہشت گرد خطرناک ہے لیکن اس سے زیادہ خطرناک اسلام کا دہشت گرد ہے۔ اسلام کا سب سے بڑا دہشت گرد مصطفیٰ کمال پاشا ہے۔ وہ جنایتکار ترین انسان کہ جس نے اسلام اور بشریت پر سب سے زیادہ جنایت کی اور ترکیہ کو تباہ کیا حالانکہ ترکی وہ ملک تھا جو کئی سو سال تک خلافت اسلامیہ کا مرکز رہا ہے۔ آدھی سے زیادہ زمین پر اس کی حکومت تھی لیکن آج ترکی میں اسلام کا نام تک لینا جرم ہے۔ آج یہ اسرائیل کا حلیف ہے کہ جس میں انسانیت کی بوتک نہیں۔ اسی طرح ہر دور میں اسلام کے دہشت گرد چلے آرہے ہیں۔ اسلام کے دشمنوں نے اسلام و مسلمین کے خلاف دہشت گردی ہر ملک اور نقطہ میں شروع کی۔

آج اہم ترین اسلامی ممالک کن کن مسائل کا شکار ہیں۔ کوئی ایسا اسلامی ملک نہیں ہے کہ جس میں دہشت گردی نہ ہو۔ سب سے بڑا اسلامی ملک انڈونیشیا ہے۔ اس بڑی مملکت کو تباہی کے دھانے پر کیسے لے آئے ہیں، اس کو توڑ کے بکھیر دیا گیا اور ابھی بھی مزید ٹوٹ پھوٹ جاری ہے۔ حتیٰ سعودی عرب جیسی اہم ترین اسلامی سرزمین میں گھس کر جا بیٹھے۔ پاکستان اسلامی دنیا میں اہم ترین اسلامی ملک ہے جس کا حشر آپ کے سامنے ہے۔ عراق جیسے اہم ترین اسلامی ملک کو کیسے ویران کیا، ایک ڈکٹیٹر کو ہٹانے کے لئے ایک گولی کافی تھی اور ان کو پتا بھی تھا کہ وہ کہاں تھا، یہ کام ان کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا بلکہ یہ اس سے زیادہ پیچیدہ کام کر چکے ہیں، اس کے محل کی ایک کھڑکی کو ایک گولی تک نہیں لگی لیکن پورا عراق تباہ ہوگیا۔ آج عراق میں شیعہ کن کن مشکلات سے دو چار ہیں، ہر روز خودکش دھماکے اور لشکروں کی چڑھائی یہ سب کچھ اسلام دشمن خود ہی

کروارہے ہیں۔سب سے بڑھ کران ذلیل دشمنوں نے اسلام، اسلامی تعلیمات اور اسلامی تہذیب و کلچر کو ہدف قرار دیا ہے۔

یہی تو اسلام کے خلاف دہشت گردی ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ جس میں اسلام کی فاتحہ پڑھنی چاہیئے۔ جیسا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے دور میں جب دہشت گردوں نے آکر اسلام کے خلاف دہشت گردی کی۔ جب ولید نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو بلایا اور یزید کا خط پڑھ کر سنایا تو اس کا یہی مضمون نکلتا تھا کہ یا ہمارے ساتھ ہوجاؤ اور میری بیعت کرو یا ہمارے مقابلے میں آجاؤ۔

آج کے دہشت گرد بھی تو یہی کہتے ہیں یا ہمارے ساتھ ہوجاؤ، جو ہمارا ساتھ نہیں دیتا وہ دہشت گرد ہے۔ رہبر انقلاب حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ نے کتنا اچھا جواب دیا کہ نہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور نہ دہشت گردوں کے ساتھ ہیں۔ ہر چند گاہ یزیدیت کی ایک قسط تکرار ہوتی ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے جب دیکھا کہ اسلام کے خلاف دہشت گردی ہورہی ہے تو آپ نے آیہ استرجاع پڑھتے ہوئے کہا:

اِنَّـا لِـلّٰـهِ وَاِنَّـآ اِلَيْـهِ رَاجِـعُـوْنَ، وَعَـلَـى الْاِسْلَامِ السَّلَامُ اِذْ قَدْ بُلِيَتِ الْاُمَّةُ بِرَاعٍ مِثْلِ يَزِيْدَ......[1]

اگر امت یزید جیسے حکمران کے نرغے میں آجائے تو بس اسلام کی فاتحہ پڑھ دو یعنی اب اسلام ختم ہوگیا۔ یزید جیسے دہشت گرد کی دہشت گردی سے اسلام کا نام ونشان تک نہیں رہے گا لیکن اس خطرناک ترین دہشت گرد کو روکنا ہے کیونکہ یہ اسلام کے خلاف دہشت گردی کررہا ہے۔ اس لئے کہ یزید کے دور میں مسلمان محفوظ تھے لیکن اسلام خطرے میں تھا لہٰذا امام حسین علیہ السلام نے وہ خونیں قیام کیا اور خون دے کر اسلام کو دہشت گردوں کے نرغے سے بچالیا۔ اگر چہ اسلام کو بچاتے بچاتے بہت قیمتی جانیں بھی چلی گئیں لیکن ان قیمتی

---

[1]......(بحار الانوار - علامہ مجلسیؒ، الجزء ٤٤، صفحہ ٣٢٦)(الملهوف علی قتلی الطفوف - علی بن موسیٰ بن جعفر بن طاووسؒ، المتوفی: سنة ٦٦٤ھ، صفحہ ٩٩)

جانوں کوقربان کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

جب ایک اسلامی ملک میں رسماً یہ اعلان ہورہا ہو کہ اس کو سکیولر اسٹیٹ بنائیں گے تو کیا ہم فقط اس لئے خوش ہوجائیں کہ ہمیں تو نہیں چھیڑیں گے، مسلمان تو محفوظ ہوں گے لیکن اسلام کو چھیڑیں گے۔ اسلام خطرے میں ہوگا۔ یہ کوئی مردانگی نہیں کہ ہم یہ کہہ کر بیٹھ جائیں کہ ہمیں تو نہیں چھیڑیں گے بلکہ ہمارے بھائیوں اور اسلام کو چھیڑیں گے۔ اپنے بھائیوں کے جنازوں اور اسلام کی عزت وعظمت کو بیچنا سرفرازی اور شرافت نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہمارے وہ بھائی جو اسلام کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر کے چلے گئے، یہ ان کے ساتھ خیانت ہے۔

............اسلام پر سب کچھ قربان!

اسلام ایک ایسی چیز ہے جس پر سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے مگر اسلام کو کسی بھی چیز پر قربان نہیں کرنا۔ حضرت امام خمینیؒ نے جب سلمان رشدی لعین کے قتل کا فتویٰ دے دیا اور فرمایا کہ آیات شیطانی کتاب کا مصنف سلمان رشدی واجب القتل ہے تو ایرانی گورنمنٹ کے بڑے بڑے ذمہ دار لوگوں نے آ کر امام خمینیؒ سے فتویٰ نہ دینے کی اپیل کی۔ کہا کہ جو آپ کررہے ہیں پتا ہے اس کے نتائج کیا نکلیں گے؟ فرمایا کیا نکلیں گے؟ انہوں نے کہا اس کے بڑے خطرناک نتائج سامنے آئیں گے۔ ہمارا بائیکاٹ ہوجائے گا، محاصرہ ہوجائے گا، سیاسی اور اقتصادی تعلقات ختم ہوجائیں گے، ابھی تو ہم آٹھ سالہ جنگ سے تازہ فارغ ہوئے ہیں۔ آخر کار ایران ختم ہوجائے گا۔

دیکھیں یہ بہت سخت جملہ ہے کہ ایران ختم ہوجائے گا۔ اگر کسی اور سے کہا جائے کہ ایران ختم ہوجائے گا تو بس کافی ہے کہ انسان کہے کہ ایران بچانے کیلئے میں دست بردار ہوجاتا ہوں، چونکہ ایران بچانا بھی بہت بڑی مصلحت ہے لیکن امام خمینیؒ نے فرمایا:

بناء نیست که ایران بماند، بناء است که اسلام بماند۔

اصل یہ نہیں کہ ایران باقی رہے بلکہ اصل یہ ہے کہ اسلام باقی رہے۔

پرواہ نہیں ہے کہ ایران رہے یا نہ رہے ، ایران سے زیادہ قیمتی چیزیں اسلام پر قربان ہوئی ہیں۔حضرت امام حسین علیہ السلام پر نظر کریں اور ایران کو دیکھیں۔کون قیمتی ہے؟ان میں سرے سے کوئی تناسب نہیں ہے۔کہاں نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کہاں خاک کا ڈھیر؟ تو کیا یہ خاک کا ڈھیر نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جتنی قیمت رکھتا ہے؟ لہٰذا ہم نے اسلام کو بچانا ہے۔اس کو بچانے کے لئے سب کچھ قربان ہوجائے تو بھی پرواہ نہیں ہے۔امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

اسلام در دست ما امانت است و ما موظفیم تا این امانت را حفظ کنیم......[1]

اسلام ہمارے ہاتھوں میں امانت ہے،ہم پرواجب ولازم ہے کہ اس امانت کی حفاظت کریں......

یہ جملہ شاید ہمارے معاشرے وماحول میں اجنبی اور ہماری فہم سے تھوڑا بالا ہولیکن ایک خاص ماحول میں یہ جملہ سمجھ میں آنے والا ہے کہ جہاں لوگوں کو معلوم ہو کہ اسلام ہمارے ہاتھ میں امانت ہے۔امانت کا تصور بہت اہم ہے۔جن کے ہاتھ میں ایک چیز امانت ہواور امانت دارانہ طریقے سے آگے منتقل کرنی ہو وہ یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ کسے بچانا ہے اور کسے قربان کرنا ہے۔جو امین ہوتے ہیں انہیں پتا ہوتا ہے کہ امانت کیسے محفوظ رکھی جاسکتی ہے؟ کس کے اختیار میں دینی ہے؟ کس کو اس میں گھسنے دینا ہے اور کس کو نہیں گھسنے دینا؟

حضرت امام حسین علیہ السلام نے روزِ عاشورہ اپنی شہادت سے ذرا پہلے استغاثہ فرمایا:

هَلْ مِنْ ذَابٍّ يَذُبُّ عَنْ حَرَمِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ؟ هَلْ مِنْ مُوَحِّدٍ يَخَافُ اللّٰهَ فِيْنَا ؟ هَلْ مِنْ مُغِيْثٍ يَرْجُو اللّٰهَ فِيْ اِغَاثَتِنَا......[2]

اسلام پر سب کچھ قربان!

---

[1]......(صحیفۂ نور-امام خمینیؒ) [2]......(الملهوف على قتلى الطفوف -رضی الدين ابی القاسم علی بن موسیٰ بن جعفربن طاووسؒ،المتوفی:٦٦٤ھ) (بحار الانوار-علامہ مجلسیؒ،الجزء٤٥،صفحہ٤٦)

ہے کوئی دفاع کرنے والا جو حرمِ رسولؐ کا دفاع کرے؟ ہے کوئی یکتا پرست جو ہمارے بارے میں اللہ کا خوف کرے؟ ہے کوئی استغاثہ سننے والا جو ہمارے استغاثہ کیلئے اللہ سے رجوع کرے......

یعنی یہاں تک تو میں نے اس امانت کو بچاتے بچاتے سب کچھ قربان کر دیا، اب کون ہے جو آگے بڑھے اور اس امانت کو بچاتا رہے لہٰذا اسلام کو الحادی افکار، سکیولرازم اور دیگر تمام باطل ازم سے بچانا ہے اور یہ کام فقط امام حسین علیہ السلام کے پیروکار کر سکتے ہیں۔

6- دین اورجدت طلبی کا تصادم

سکیولرازم کی پیدائش کے لئے چھٹا سبب دین اور جدت طلبی کا تصادم اور مقابلہ ذکر کیا گیا ہے۔ دین مسیحیت کے اندر تجدد کو دین کے خلاف تصور کیا گیا اور ہر جدید حرکت کا سختی سے مقابلہ کیا گیا حالانکہ ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ پیش رفت، ترقی، تکامل اور تجدد کی طرف گامزن ہو۔

اگر انسان کو ترقی و پیشرفت کرنے سے روکا جائے اور کہا جائے کہ آپ نے گاڑی یا ہوائی جہازوں کے ذریعے سفر نہیں کرنا بلکہ اب بھی گھوڑوں، خچروں اور اونٹوں پر سفر کرنا چاہئے، آپ کو کسی بھی جدید مشینری اور جدید وسائل سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے تو اس کا طبعی نتیجہ یہ نکل آئے گا کہ لوگ آہستہ آہستہ اس دین سے بیزار ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ تجدد انسانی طبیعت کا لازمہ ہے۔ انسان کو اگر جدت طلبی اور جدت خواہی سے روکا جائے تو یہ اس کی طبیعت اور فطرت سے مقابلہ کرنا ہے۔ ہر دن انسان اپنی فطرت اور طبیعت کے مطابق نئے اعمال انجام دے کر نئے ہدف اور مقصد کی تلاش میں ہے۔

دین مسیحیت میں بشری تصرفات کی وجہ سے یہ مشکل کھڑی ہوئی کہ بالآخر انہوں نے دین کو تجدد کے خلاف تصور کیا اور ہر جدید حرکت وجدت خواہی کا سختی سے مقابلہ کیا۔ اس بابت انہوں نے مسیحیت کے پیروکاروں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جس کا طبعی نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے مسیحیت کو لوگوں کی زندگی سے باہر نکال دیا۔ دوسرے اسباب کے ساتھ اس سبب نے بھی دین کو لوگوں کی زندگی سے باہر نکالنے میں بڑا کردار ادا کیا۔

......اسلام اور جدت پسندی

آیا اسلام میں تجدد کے خلاف فضاء پائی جاتی ہے؟! اسلام کو پڑھے بغیر عام طور پر یہ تأثر دیا جاتا ہے کہ اسلام بھی جدت پسندی کا مخالف ہے۔ یہ اسلام نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے کہ چونکہ وہ بھی دین ہے اور یہ بھی اور دین تجدد کے خلاف ہے لہٰذا اسلام بھی تجدد کا مخالف ہے۔ مولانا روم کے بقول یہ ایک ایسا قیاس ہے جس سے انسان کو ہنسی آتی ہے:

از قیاسش خندہ آمد خلق را

کو چو خود پنداشت صاحب دلق را......[1]

یہ مضحکہ خیز قیاس ہے کہ مسیحیت اور اسلام دونوں دین ہیں اور دین کی مشکلات ہمیشہ ایک جیسی ہوتی ہیں۔ قطعاً ایسا نہیں ہے۔ اگر چہ اسلام عہد قدیم اور سابقہ زمانے میں ایک لائحہ عمل اور منشور کے طور پر پیش ہوا لیکن یہ ہر زمانے کے ساتھ نہایت ہی سازگار رہے۔

اسلام اور جدت پسندی

......روشن فکروں کا فرسودہ اعتراض

اہم ترین نکتہ کہ جسے روشن فکر آب اٹھاتے ہیں وہ یہ ہے کہ دین میں تجدد کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اسلام کے اندر بعض ایسی چیزیں ہیں جو تجدد ناپزیر ہیں۔ جن میں تغیر اور تبدیلی آنا ممکن نہیں ہے جبکہ آج کا بشر متغیر، متحول اور جدید ہے۔ اس کی زندگی میں بہت سارے انقلابات رونما ہو چکے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک پرانا اور قدیم آئین جو بہت سادہ سی زندگی کے لئے مقرر کیا گیا تھا اس پیچیدہ دور کی زندگی میں بھی انسان کی نجات کا وسیلہ بن سکے؟ ان کا کہنا ہے کہ اسلام عہد قدیم کے لئے آیا تھا لہٰذا عہد جدید اور ماڈرن زندگی گزارنے کے لئے لائحہ عمل نہیں بن سکتا۔

---

[1]......(مثنوی معنوی، دفتر اول، بخش ۱۱، حکایت بقال و طوطی وروغن ریختن طوطی در دکان)

............اعتراض کا جواب

یہ اعتراض اور اس جیسے دوسرے اعتراضات اسلام سے آشنائی نہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام جان لینے سے خود بخود بہت سارے حقائق کھل جاتے ہیں۔اسلام انسان کی حیات کے مطابق ہے چونکہ اسلام ملائکہ، شجر وحجر اور حیوانات کے لئے نہیں بلکہ انسان کے لئے ہے۔تو جیسا انسان ہوگا ویسا دینی دستور بھی ہوگا۔انسان میں تبدیلی آئے گی تو دین میں بھی خوانخواہ تبدیلی آئے گی اور اگر انسان نہیں بدلا تو دین بھی تبدیل نہیں ہوگا۔

............انسان کے دو مختلف پہلو

انسان کس چیز کا نام ہے؟ آیا انسان فقط طبیعت اور جسم کا نام ہے؟ آیا فقط جسمانی تقاضوں، خواہشات، غرائز، وسائل زندگی اور محیط زندگی کا نام ہے؟ اگر انسان فقط یہی ہے پھر تو واقعاً دین بہت قدیمی ہے اور انسان کی یہ زندگی اور یہ شعبہ حیات بہت متحول اور تبدیل ہو چکے ہیں۔ایک پرانی چیز کبھی بھی اتنی محدود اور متغیر حیات کے لئے کافی نہیں ہے لیکن اگر انسان میں دو پہلو ہیں یعنی ایک متغیر اور دوسرا غیر متغیر ہے تو لامحالہ دین کے بھی دو پہلو ہوں گے۔انسان میں ایک فطرت جبکہ دوسرا طبیعت کا پہلو ہے اور جسمانی وفطری تقاضوں میں فرق ہے۔

انسان کی طبیعت میں تجدد ہے لیکن انسانی فطرت میں ہرگز کوئی تبدل وتجدد نہیں ہے۔انسانی فطرت ایک ہی اساس پر ہے۔قرآن کریم کا صریح فرمان ہے:

فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡهَا لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ......[1]

یہ فطرتِ الٰہی وہ ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں آتی......

---

[1]......(سورة الروم/۳۰)

اس خلقتِ خدا میں کہ جس کا نام فطرت ہے کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں ہے لہٰذا بشر کے فطری تقاضے جو آغازِ خلقت میں تھے وہی تقاضے آج بھی ہیں اور وہی آئندہ ہزار سال بعد بھی رہیں گے۔ کہتے ہیں کہ انسان کی عمر چھ ہزار سال سے اوپر ہو چکی ہے، تو اس میں دیکھیں کہ کس عہد میں انسان کے فطری تقاضے مختلف رہے ہیں؟! مثلاً عہد قدیم کے بشر کی فطرت کچھ اور اقتضاء رکھتی ہو اور موجودہ زمانے کے بشر کی فطرت کچھ اور۔ البتہ طبیعت میں فرق آیا ہے۔ ممکن ہے اس زمانے کے بشر کے طبعی تقاضے کچھ اور ہوں اور اِس زمانے کے طبعی تقاضے کچھ اور۔ اسی طرح وہ دین ومنشور جو انسان کی زندگی کیلئے مدوّن ومرتب ہوا ہے وہ بھی دو حصوں پر مشتمل ہے۔

دین کا وہ حصہ جو انسانی فطرت سے مربوط ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئے گی۔ یہی دین کے بنیادی اور اساسی اصول ہیں جو کبھی بھی تبدیل نہیں ہوں گے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دین کا ایسا شعبہ بھی ہے جو ہمیشہ اور ہر دم تبدیل ہوتا رہا۔ دین نے خود اس کو تبدیل کیا ہے یعنی شریعتیں بدلتی رہیں۔ مختلف انبیاء علیہم السلام مختلف شریعتیں لاتے رہے جو ان کے زمانوں کے تقاضوں کے عین مطابق تھیں۔ یہاں تک کہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت تک نوبت آ پہنچی جو سب سے آخری اور سب سے کامل شریعت ہے۔

شریعت کا لغوی معنٰی گھاٹ کے ہیں۔ یعنی دین دستورِ زندگی ہے اور برنامۂ زندگی لینے کے لئے جو گھاٹیں مقرر ہیں ان کا نام شریعت ہے۔ ہر قوم ونسل کیلئے ایک جدا گھاٹ اس کے مزاج، طبیعت اور ضرورتوں کے مطابق بنائی گئی۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ پرانے دستور سے نئی نسل یا نئے دستور سے پرانی نسل کو چلایا جائے۔

...........اجتهاد اور تجدد

ممکن ہے ذہن میں یہ سوال آئے کہ شریعتوں کے تبدل کا سلسلہ بھی تو ایک جگہ پر آ کر رک گیا کیونکہ اب شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی شریعت نہیں آئے گی حالانکہ حیات بشری میں مسلسل تبدیلی آتی رہی ہے اور آئندہ بھی تبدیل ہوتی رہے گی۔ صدر اسلام سے لے کر آج تک زندگیٔ بشر کو دیکھیں تو زمین وآسمان کا فرق

نظر آتا ہے۔آپ کے آباؤ اجداد اگر آپ کو ہوائی جہاز پر سفر کرتے ہوئے دیکھیں، کمپیوٹر پر بیٹھا ہوا دیکھیں، آپ کے امکانات و وسائل، اونچی اونچی بلڈنگز اور یہ تہذیب وتمدن دیکھیں تو ان کو ہرگز باور نہیں ہوگا کہ یہ ہماری نسل ہے۔ وہ سمجھیں گے شاید یہ کوئی خلائی موجود ہے۔ان کے تصور میں بھی یہ باتیں نہیں تھیں کہ ہماری اولادیں یہاں تک جا پہنچیں گی اور اگر یہ اولاد ان کے عہد میں چلی جائے، ان کا گھر، کھانا پینا، ظروف، لباس و رہن سہن دیکھیں تو حیران ہو جائے کہ یہی ہمارے آباواجداد تھے۔ جب ان چودہ سو سالوں میں اتنا فرق آیا ہے تو پھر ہم کیوں کہتے ہیں کہ یہ شریعت قیامت تک کافی ہے؟ آیا اب طبیعت اور حیاتِ بشری میں تبدیلی نہیں آئے گی؟

جواب یہ ہے کہ طبیعتِ بشری میں تبدیلی ضرور آئے گی لیکن دین کے مراحل ہیں۔ان میں سے کچھ طے ہوئے اور کچھ ابھی طے ہو رہے ہیں۔ان مراحل کو تفصیل سے بیان کرنا ''فلسفہ ختم نبوت'' کی بحث سے مربوط ہے۔ ہماری اس گفتگو میں ان مراحل کو تفصیل سے بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔اس میں ہمیں اتنا ثابت کرنا ہے کہ دین مسیحی یقیناً تجدد کے خلاف تھا لیکن دین اسلام ہرگز ایسا نہیں ہے۔تجدد دین اسلام کی طبیعت میں ہے لیکن نہ پورا دین، نہ بنیادیں اور فطرت سے متعلق شعبہ چونکہ فطرت میں تغیر وتبدل نہیں آسکتا۔

ابتدائی انسان، آج کے انسان اور قیامت تک کے انسان کی فطرت ایک ہی ہے لہٰذا دین کا بھی وہ شعبہ جو فطرت سے متعلق ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔اگر تبدیل کریں تو انسان کے لئے نقصان دہ ہے لیکن شریعت کا وہ حصہ جو جسمانی اور طبعی امور سے متعلق ہے اس میں تبدیلی آئے گی۔اس شریعت میں بھی ان امور کی تبدیلی آسکتی ہے یعنی شریعتِ خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بھی اس کی چارہ جوئی موجود ہے اور وہ چارہ جوئی عنصر اجتہاد کی شکل میں ہے۔

..........فلسفۂ اجتهاد

وہ کام جو پہلے شریعتوں کے نسخ سے انجام پاتا تھا اب اجتہاد کے ذریعے انجام پاتا ہے۔یعنی دین کو

زمانے کے حالات اور مقتضیات کے ساتھ مطابقت دینے یا حیاتِ بشر کو دین کے مطابق رکھنے کا نام اجتہاد ہے۔اجتہاد زندگیٔ بشر میں نہیں کرنا بلکہ دین میں کرنا ہے۔ لہٰذا جیسے جیسے انسان کی طبیعت اور ماحول میں تبدیلیاں آتی رہیں گی، اجتہاد ان تبدیلیوں کے ساتھ دین کو ہم آہنگ کرتا جائے گا۔

اب یہ سوال کہ ختم نبوت کے بعد سلسلہ اجتہاد کیوں شروع ہوا؟ نسخ شرایع والا سلسلہ کیوں ختم ہوا؟ اب یہ سب سوال ہیں اور ذہن میں آنے چاہئیں لیکن ان کے بیان کا اپنا محل ہے۔ اگر ہمارا موضوع فلسفۂ ختم نبوت ہوتا تو اس پہلو کو زیادہ چھیڑتے لیکن ابھی ہمارا موضوع یہ ہے کہ دین اسلام ہرگز تجدد کے خلاف نہیں ہے بلکہ ایک ایسا دین ہے جس کی طبیعت میں تجدد موجود ہے۔ اس سلسلہ میں آپ اسلام کو دیکھیں، مسلمانوں کو نہ دیکھیں چونکہ بات اسلام کی ہوتی ہے اور سوال مسلمانوں کے بارے میں ہوتے ہیں۔ ابھی ہم اسلام کی بات کر رہے ہیں جبکہ مسلمانوں اور اسلام میں بہت فاصلہ ہے۔ ہم اسلام تک کب پہنچیں گے یہ معلوم نہیں ہے۔

مسلمانوں کی مشکلات زیادہ ہیں۔ مسلمانوں کے اجتہاد کی موجود شکل اور بات ہے اور اسلام نے اجتہاد کی جو تصویر پیش کی ہے وہ اور ہے۔ مسلمانوں کے دو بڑے فرقے یعنی اہل سنت اور شیعہ نے مل کر ایک زمانے تک اجتہاد کیا لیکن ایک زمانے کے بعد اہل سنت میں یہ سلسلۂ اجتہاد روک دیا گیا اور شیعہ میں یہ سلسلہ اجتہاد جاری رہا۔ ابھی بھی شیعہ اجتہاد کے قائل ہیں لیکن نتیجہ میں دونوں پھر بھی ایک ہیں۔ یعنی اجتہاد کا دروازہ کھولے رکھ کر بھی اسی نقطہ پر کھڑے ہوئے ہیں جس پر وہ اجتہاد کا دروازہ بند کر کے کھڑے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی موجودہ حالت ہے لیکن اسلام نے اپنی تعلیمات میں یہ عنصر اس لئے رکھا کہ دین ہمیشہ زندگیٔ بشر کے ساتھ ہم آہنگ رہے۔ یہ نہ ہو کہ انسان آگے نکل جائے اور دین پیچھے رہ جائے یا دین آگے نکل جائے اور انسان پیچھے رہ جائے۔ فلسفۂ اجتہاد یہی ہے۔

پس جس دین میں اجتہاد ہو اس دین کیلئے یہ کہنا کہ اس میں تجدد کی گنجائش نہیں لہٰذا سکیولرازم کے لئے زمینہ فراہم ہے تو یہ دین سے دوری اور دین کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اجتہاد پر مشتمل دین کبھی بھی سکیولرازم کے لئے ماحول فراہم نہیں کرتا۔ اجتہاد کے ہوتے ہوئے کسی ازم کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

دین مسیحیت کے اندر اجتہاد نامی یا اس طرح کی کوئی چیز موجود نہیں ہے بلکہ دین مسیحیت کی تجدد کے ساتھ معرکہ آرائی نے سکیولرازم کے لئے میدان فراہم کیا لہٰذا سکیولر تحریک نے ایک زمانے میں یہ شکل اختیار کر لی کہ سکیولرازم کی جگہ ماڈرن ازم کہا جاتا تھا۔ پس اس زمانے میں تجدد گرائی کی ترویج ہونے لگی۔

......اسلام، ترقی پسند دین

اسلام نہ صرف تجدد اور ترقی سے نہیں روکتا بلکہ اسے تدین اور دینداری ہی نہیں مانتا جس میں ترقی نہ ہو۔ اسلام ترقی خواہ مذہب ہے۔

اسلام کے پیشوا حضرتِ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنْ اِعْتَدَلُ یَوْمَاہُ فَھُوَ مَغْبُوْنٌ......۱

جس کے دو دن ایک جیسے گزر جائیں وہ دھوکا میں ہے......

اسی طرح امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاہُ فَھُوَ مَغْبُوْنٌ، وَمَنْ کَانَ اٰخِرُ یَوْمَیْہِ خَیْرَھُمَا فَھُوَ مَغْبُوْطٌ، وَمَنْ کَانَ اٰخِرُ یَوْمَیْہِ شَرَّھُمَا فَھُوَ مَلْعُوْنٌ، وَمَن لَّمْ یَرَالزِّیَادَۃَ فِیْ نَفْسِہٖ فَھُوَ اِلَی النُّقْصَانِ، وَمَنْ کَانَ اِلَی النُّقْصَانِ فَالْمَوْتُ خَیْرٌ لَّہٗ مِنَ الْحَیَاۃِ......۲

۱......(من لا یحضرہ الفقیہ - للشیخ الجلیل الاقدم الصدوق أبی جعفر محمد بن علی بن الحسین بن بابویہ القمیؒ،المتوفی: سنة ۳۸۱ھ،باب النوادر،الجزء ٤،صفحہ ۳۸۲)

(مستدرك الوسائل ومستنبط المسائل- المحدثین الحاج میرزا حسین النوری الطبرسیؒ،الجزء۱۲،صفحہ۱۵۲)

۲......(معانی الاخبار- الشیخ أبو جعفر محمد بن علی بن الحسین بن بابویہ الفقیہ القمیؒ)

(وسائل الشیعة-الفقیہ المحدث الشیخ محمد بن الحسن الحُر العاملیؒ،الجزء۱٦،صفحہ۹٤)

جس کے دو دن مساوی گزر جائیں وہ دھوکا میں ہے، جس کے دو دنوں میں سے دوسرا دن پہلے دن سے بہتر ہو وہ فائدہ میں ہے، جس کا دوسرا دن پہلے دن سے بدتر ہو وہ ملعون ہے، جو اپنے نفس کے اندر (خیر کی) زیادتی نہیں دیکھتا وہ نقصان میں ہے اور جو نقصان میں ہے اس کیلئے زندگی سے بہتر موت ہے......

اگر ہم واقعاً اسلام کو اس کے اصلی منابع اور پیشواؤں سے سمجھے ہوئے ہوتے تو آج ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔ سب سے برا گدا وہ ہے جو خود سرمایہ دار ہو۔ ہم مسلمان جب اس قسم کے ازم کی بات کرتے ہیں تو درحقیقت ہم وہ سرمایہ دار ہیں جو گدا بن گئے ہیں یعنی اپنے پاس ترقی خواہ اور ترقی یافتہ مذہب رکھتے ہوئے پھر بھی دوسروں کی تہذیب کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔

افکار، تہذیب وثقافت کی گدائی سب سے بری گدائی ہے جس میں ہم مبتلا ہیں حالانکہ اسلام کے پیشوا فرماتے ہیں کہ وہ شخص خسارہ میں ہے اور ملعون ہے جس کے دو دن ایک جیسے گزر جائیں۔

سورۂ عصر میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْعَصْرِ ٥ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ٥......[1]

عصر کی قسم۔ انسان خسارہ میں ہے۔

کون سا انسان خسارہ میں ہے؟ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں وہ کہ جس کے دو دن ایک جیسے گزر جائیں۔ کل جتنا کمایا تھا وہی آج بھی کماؤ تو یہ خسارہ ہے۔ یہ ترقی کے بنیادی اصول ہیں۔ اگر ہم اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں ان اصولوں کو لے آئیں کہ دو دن ایک جیسے نہیں گزرنے چاہئیں تو مسلمانوں کی حالت ابتری سے باہر آسکتی ہے۔ سکیولرازم کے چاہنے والے اسلام کے ان ہی زرین اصول سے ڈرتے ہیں۔ ان کو یہی خطرہ لاحق ہے کہ اگر دین اسلام اپنے زرین اصولوں سمیت نافذ ہوگیا تو ان کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔ ان کی سرمایہ داری اور ترقی کو خطرہ ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ سب ترقی کریں بلکہ چاہتے ہیں کہ صرف وہی

---

[1]......(سورۃ العصر/ ۲-۱)

سرمایہ دار بنیں اور وہی ترقی و پیشرفت کریں۔

اسلام میں سکیولرازم کا داخلہ ممنوع

یہاں ہم نے ان چھ عوامل واسباب کا مختصر سا تذکرہ کیا کہ جنہوں نے مل کر مسیحیت میں سکیولرازم کو جنم دیا۔ یہ چھ اسباب ایسے ہیں کہ جس دین کے اندر بھی پائے جاتے ہوں اس دین کو زندگی کے منشور کے طور پر لینا ممکن نہیں اور طبعی طور پر ایسا دین لوگوں کی زندگی سے باہر چلا جائے گا۔ مسیحیت کے اندر یہ سارے اسباب موجود تھے اس لئے اس کی جگہ سکیولرازم آ گیا لیکن دین اسلام میں سکیولرازم کو جنم دینے والے اسباب ہرگز موجود نہیں ہیں لہٰذا اسلام میں سکیولرازم کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہاں ہماری بحث کا موضوع اسلام اور سکیولرازم ہے نہ کہ مسلمان اور سکیولرازم۔ مسلمان سکیولر ہو سکتا ہے۔ جیسے کہ عملی طور پر ہم سب مسلمان سکیولر ہیں حتیٰ کہ متدین مسلمان بھی سکیولر ہیں۔ کیونکہ دیندار مسلمان اپنی زندگیوں سے کچھ اوقات نکال کر مذہبی رسومات انجام دیتے ہیں اور باقی زندگی کسی اور ازم، آداب اور قوانین کے تحت گزارتے ہیں۔

فصل پنجم

سکیولرازم کے ہمزاد مکاتب

سکیولرازم کے لوازمات کی شروعات

سکیولرازم ایک ایسا تفکر ہے جس کے ہمزاد، ہم قبیلہ، ہم قوم اور ہم نژاد بھی موجود ہیں۔ جب تک یہ سب بہن بھائی مل نہ جائیں سکیولر ماحول پیدا نہیں ہوتا یعنی اگر انہیں نظر انداز کر دیں تو سکیولرازم کے لئے قطعاً گنجائش نہیں رہتی۔ وہ کون سی چیزیں ہیں جو سکیولرازم کے ہمراہ وجود میں آتی ہیں؟ اور یہ بگاڑ کس طرح اور کہاں پیدا ہوا؟ کچھ روشن فکر مآب لوگوں نے مسیحیت میں پیش آنے والے مسائل اور طبعی حالات سے فائدہ اٹھا کر عمداً یہ بگاڑ پیدا کیا۔ ان روشن فکر مآب لوگوں نے پوری شدّت کے ساتھ ایک اور خیانت و جنایت انجام دی۔

شاید آپ تعجب کریں گے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟! اس لئے کہ انہوں نے جن خوبصورت الفاظ کے ساتھ اسے ترویج کیا وہ ہر انسان کو دھوکا میں مبتلا کر سکتا ہے حتیٰ کہ خود دینداروں کو بھی ان کی باتیں پسند آنا شروع ہوگئیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو نمبر چیزوں کی پیکنگ نہایت اچھی کی جاتی ہیں تا کہ اصلی سے بھی بہتر نظر آئیں۔ خام لوگ پیکنگ دیکھ کر کسی چیز کا انتخاب کرتے ہیں لیکن پختہ آدمی پیکنگ کو نہیں دیکھتا بلکہ اندر رکھی ہوئی چیز کی کیفیت دیکھتا ہے لہٰذا انہوں نے بہت خوبصورت ناموں، خوبصورت شعاروں اور خوبصورت عناوین کے ساتھ ان افکار کی ترویج کی۔ اسی ظاہری حسن کی بناء پر ان افکار کو عام مقبولیت بھی ملی حتیٰ کہ دینی معاشروں اور دینی ماحول میں بھی مقبولِ عام وخاص واقع ہوئے۔

جیسے آزادی اور حریت ایک ایسا خوبصورت نام ہے کہ اسے کسی کے اوپر منطبق کر دو تو وہ انسان کے لئے پسندیدہ چیز ہوجاتی ہے۔ جنایت کارترین چہرے اگر اپنے آپ پر آزادی کا لیبل لگا کے باہر آئیں تو سب کے لئے قابل قبول ہیں مثلاً ہٹلر اگر اپنی پیشانی پر آزادی کا لیبل لگا کر باہر آئے تو یہی منفور چہرہ انسانیت کا پیشوا بن جاتا ہے۔ اپنے زمانے میں انہوں نے یہی کام کیا جس سے سکیولرازم کے لئے میدان فراہم ہوا۔ اگر کوئی ایسی حرکت نہ بھی کرتا تب بھی دین مسیحیت کے خلاف ایک نہضت خود ہی خود چل پڑی تھی۔ ان روشن فکروں

نے اس سے بھر پور فائدہ اٹھایا اور انسانی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ انہوں نے طبعی اور فطری تقاضوں کے انسانی افکار کے دائرہ کا رُخ مخالف سمت میں بالکل ایک سو اسی درجہ کی طرف کر دیا۔ یہ کام اتنی خوبصورتی سے انجام پایا کہ انسان کو معلوم بھی نہیں ہو سکا کہ اسے کسی اور سمت لگا دیا گیا ہے۔ اب ہم سکیولرازم کے ہمزاد مکاتب کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں۔

1-ھیومینزم (Humanism)

نام نہاد روشن فکروں کی فکری جنایتوں میں سے ایک جنایت یہ ہے کہ انہوں نے انسان کی زندگی کو خدا محوری سے ہٹا کر انسان محوری پر مرکوز کر دیا۔ اس تفکر کا نام ''ہیومینزم'' (Humanism) ہے یعنی انسان گرائی (انسان پسندی)، انسان محوری اور بعض کی تعبیر کے مطابق انسانِ خدائی حالانکہ ہر دین آسمانی میں اصلی مقصد و محور ذاتِ خدا ہے یعنی سب ادیان کی تعلیمات، اصول، فروع اور ثمرات پر رنگِ توحیدی ہے۔ اگرچہ خود اہل دین بھی بعض اوقات منحرف ہو جاتے ہیں اور غیر خدائی راستہ اپنا لیتے ہیں۔ وہ دینی مقاصد کے بجائے دینی فوائد کی طرف زیادہ توجہ رکھتے ہیں۔

مقصد اور فائدے میں فرق ہے۔ دین کا مقصد یہ ہے کہ انسان، خدا محور ہو اور انسانی زندگی کا مقصد بھی یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کے قریب کرے یعنی قربتِ خدا حاصل کرے۔ اسی کو تکامل، تکمیل یا فلسفۂ خلقت کہتے ہیں۔ یہ دین کا محور ہے اور تمام ادیان آسمانی ایسے ہی ہیں خصوصاً قرآن مجید نے جہان شناسی اور انسان شناسی کے لئے جو تعبیر پیش کی ہے اس کے لئے یہی عنوان پیش کیا ہے۔ یہ آیۂ مجیدہ انسانی مقصد حیات کی وضاحت کرتی ہے:

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ٥......[1]

---

[1]......(سورة البقرة/١٥٦)

ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔

یعنی تمام عالم ہستی خدا کی طرف متوجہ ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو نہ فقط ادیان نے پیش کیا ہے بلکہ اسی راستے کے لئے عقلی دلیلیں بھی بقدر کافی موجود ہیں۔ فرض کریں کہ خدانخواستہ کوئی آسمانی کتاب نہ بھی ہوتو بھی یہ راستہ قابلِ تصور اور قابلِ تصدیق تھا لہٰذا عقل اور نقل دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ o

اگر آپ قدیم فلاسفہ یعنی قبل از میلادِ مسیحؑ کے فلاسفہ کو پڑھیں تو وہ بھی یہی کہتے نظر آئیں گے اور دین مسیحیت کے بعد جو حکماء آئے خصوصاً اسلامی دور میں جو حکماء آئے ان کا بھی یہی کہنا ہے۔

پس بقدرِ کافی دلائلِ عقلی موجود ہیں کہ انسان خدا کی جانب سے ہے اور خدا کی جانب جارہا ہے۔ یعنی انسانی زندگی کا مرکز ومحور ذاتِ خدا ہے۔ نہ صرف انسانی زندگی بلکہ پورے عالم ہستی میں محور اور مرکز ذاتِ خداوند تبارک وتعالیٰ ہے لیکن ان روشن فکروں نے ایک فکری جنایت اتنی خوبصورتی سے انجام دی کہ سب کو اپنی چال بازیوں سے فریفتہ کردیا۔ جنایاتِ جسمانی و بدنی انجام دینے والوں سے جنایاتِ فکری انجام دینے والے کہیں زیادہ سفاک تر ہیں مثلاً اگر میکاولی (Machiavelli) جیسے جنایتِ فکری انجام دینے والوں کے تباہ کن نتائج کا موازنہ ومحاسبہ جسمانی جنایت کاروں کے افعال سے کریں تو فکری جنایت کار کہیں زیادہ بُرے نکلیں گے۔

ان فکری جنایت کاروں نے خدا کو انسان کی زندگی سے نکال کر کہا کہ انسان کی زندگی کا مبدأ اور منتہیٰ خدا نہیں ہے۔ انہوں نے خدا کی جگہ انسان کو رکھ دیا۔ خدا نے کہا ہے کہ انسان خلیفۂ خدا ہے لیکن انہوں نے صاف کہہ دیا کہ خلافت سے مراد بھی یہی تو ہے کہ خدا کو ہٹا کر اس کی جگہ انسان کو محور قرار دیں۔ اس وقت ان ساحروں کے جادو میں سب مسحور ہیں۔ معلوم نہیں کہ کب اس سحر سے باہر آتے ہیں اور متوجہ ہوتے ہیں حالانکہ دین نے جو کہا ہے کہ انسان خلیفۂ خدا ہے تو اس کا معنٰی یہ ہے کہ انسان مظہرِ صفاتِ خدا ہے، خدائی راستہ پر ہے اور خدا کی طرف متوجہ ہے۔ یعنی انسان کی زندگی کا محور ومرکز خدا ہے کیونکہ خدا اس کا خالق ہے۔

لیکن انہوں نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کیلئے خدا کو محوریت اور مرکزیت سے ہٹا کر وہاں پر انسان کو رکھ دیا۔ انہوں نے انسان کو خدا بنا دیا اور کہا کہ زندگی کا مقصد انسان ہے جبکہ تمام ادیانِ آسمان کا طریقہ یہ ہے کہ انسان خدا کے لئے ہے، خدا کی جانب سے ہے اور خدا کی طرف جا رہا ہے اور ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ خدا نے انسان سے کیا چاہا ہے لیکن انہوں نے بیان کیا کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ خدا نہیں ہے بلکہ سوال کو تبدیل کر دو اور یہ کہو کہ انسان نے خدا سے کیا چاہا ہے؟! اس لئے کہ خدا انسان کے لئے ہے چونکہ محور انسان ہے اور جو چیز انسان کے لئے مفید ہے وہ ٹھیک ہے، اس کو ہونا چاہئے مثلاً پانی جو بقاء اور حیات کا ایک لازمہ ہے اس کو ہونا چاہئے لیکن جو چیز زندگی بشر میں کام نہیں آتی وہ غیر ضروری اور فالتو چیز ہے، وہ نہ بھی ہو تو کوئی نقصان نہیں ہوتا لہٰذا انسان کی خاطر خدا کو ہونا چاہئے۔ خدا انسان کی ضروریات میں سے کون کون سی ضروریات پوری کر سکتا ہے؟ اور اگر کوئی ضرورت پوری نہیں کر سکتا تو اس خدا کی انسان کی زندگی میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں دین یہ کہتا ہے کہ تم خدا کی خاطر ہو، تمہارا مقصد خدا ہے یا آج کی تعبیر کے مطابق کہ انسان خادمِ دین و خادمِ خدا ہو البتہ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ خدا کو واقعاً انسانی خدمتوں کی ضرورت ہے۔ ایک تعبیر کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ اس کا برعکس قضیہ ہیومینزم کی اساس ہے کہ (نعوذ باللہ) ''انسان مخدوم ہے اور خدا خادم''، خدا انسان کی خدمت کرے لہٰذا ہر چیز کی قدر و قیمت کا محور انسان ہے۔ اس نظریہ کے حامی کہتے ہیں کہ بے شک خدا و دین کا تصور ہو لیکن سب کے سب اس مقصد کے لئے ہوں کہ انسان کے کسی کام آئیں گے؟ یہ انسان کی کون سی ضرورت پوری کریں گے؟

یہی پہلا انحراف تھا جو دین کے مقابلے میں عمداً ایجاد کیا گیا۔ یہ طبعی حالات کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یہاں پر عمداً ایسا کیا گیا کہ انسان کی زندگی سے خدا کو نکال کر زندگی کا محور انسان بنا دیا گیا۔

......انسان، ھیومینزم(Humanism)کے نقطۂ نظر سے

ہیومینزم میں انسان کو محوری اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ انسان کیا

ہے؟ تو کہتے ہیں کہ یہی ہے جو ظاہری طور پر ہمیں نظر آتا ہے، جو چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا ہے۔ فطرت اور فطری امور یہ سب من گھڑت باتیں ہیں، انسان صرف غرائز کے مجموعے کا نام ہے۔ یعنی انسان طبیعت اور جسم کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

ان کے مطابق اگر خدا انسان کی کوئی خدمت کرسکتا ہے، غرائز بشری کی تکمیل و تسکین کیلئے خدا کے پاس کچھ ہے تو اس خدا کی گنجائش و ضرورت ہے ورنہ خدا کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اس صورت میں انسان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہیومینزم، غرائز محوری کا دوسرا نام ہے چونکہ مکتبِ ہیومینزم میں مرکزی نقطہ انسان ہے۔ سب کچھ انسان کیلئے ہے اور انسان غرائز کا مجموعہ ہے لہٰذا ہیومینزم غرائز محوری کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ حالانکہ دین کے نقطہ نگاہ سے انسان غرائز و فطرت یا جسم و روح سے مرکب ہے لیکن انسان کی اصل حقیقت روح، فطرت اور روحانیت ہے جبکہ جسم اس روح کے لئے مرکب ہے۔ یعنی غرائز اور فطرت روحانی تکامل کے لئے وسیلہ ہیں۔

لہٰذا ہیومینزم انسان محوری اور دین خدا محوری کی طرف دعوت دیتا ہے۔ دین کے اندر فرائض ہیں جو ہر انسان کو ادا کرنے ہیں البتہ دین کی طرف سے عائد شدہ ذمہ داریوں کو انجام دینے کے نتیجہ میں کچھ حقوق بھی پیدا ہوتے ہیں لہٰذا حقوق کی پیدائش فرائض کے دامن سے ہوتی ہے۔ اگر فرائض نہ ہوں یا کوئی اپنی ذمہ داری انجام نہیں دیتا تو اس کے مقابلے میں اس کا کوئی حق بھی نہیں بنتا مثلاً شوہر اور بیوی کے ایک دوسرے پر حقوق بھی ہیں اور ایک دوسرے کے مقابلے میں ذمہ داریاں بھی رکھتے ہیں۔ اگر دونوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی ذمہ داری انجام دے تب ہی ایک دوسرے کی گردن پر حق پیدا ہوتا ہے۔ اگر شوہر اپنی ذمہ داریاں انجام نہ دے مثلاً بیوی کو نفقہ یعنی مکان، لباس اور خوراک وغیرہ نہ دے تو بالمقابل بیوی پر اس کے حقوق بھی نہیں بنتے۔ اسی طرح اگر بیوی اپنے فرائض کی انجام دہی سے کوتاہی کرے تو اس کا کوئی حق نہیں بنتا کہ اپنے شوہر سے نفقہ کا مطالبہ کرے لہٰذا وہ انسان جو خدا محور ہو اس کی زندگی میں فرائض اور ذمہ داریوں کی بات ہے لیکن ہیومینزم میں

فرائض کے بجائے حقوق کی بات ہے اور حقوق کو فرائض کا مقام دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں یہ نہ کہو کہ انسان ایک ذمہ دار موجود ہے بلکہ کہہ دو کہ انسان ایک ذی حق مخلوق ہے۔ اس لئے اس وقت دنیا میں اصلی ترین بحث انسانی حقوق کی بحث ہے۔

......ہیومینزم کی نگاہ میں انسانی حقوق

جیسے ذوی الحقوق ہوتے ہیں ویسے ہی حقوق ہوتے ہیں مثلاً جانوروں کے حقوق میں تعلیم و تربیت، لکھنا پڑھنا تو نہیں ہے بلکہ جانوروں کے حقوق میں یہ ہے کہ اس کو چارہ کھلاؤ تا کہ بھوکا اور پیاسا نہ رہے یا مثلاً جنگل کے حقوق سے مراد یہ تو نہیں ہے کہ جنگل میں یونیورسٹی بنائیں بلکہ جنگل کے حقوق یہ ہیں کہ جنگل نہ کاٹو، جنگل کو آگ نہ لگاؤ، اس کو پانی دو یعنی کوئی شے جیسی ہوگی ویسا اس کا حق ہوگا۔

لہٰذا ہیومینزم کے نزدیک انسانی حقوق سے مراد یہ ہے کہ چونکہ ہیومینزم کے نقطۂ نظر سے انسان غرائز کا مجموعہ ہے لہٰذا غرائز سے متعلقہ ہر چیز انسانی حق ہے۔ انسان جو غریزہ چاہتا ہے وہ انسانی حق شمار ہوتا ہے اور وہ آپ کو فراہم کرنا چاہئے۔ یہ حقوقِ بشر (Human Rights) ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں کہ ہم نے حقوق بشر کا ملاً فراہم کر دیئے ہیں۔ ہم نے یہ حق بھی فراہم کر دیا ہے کہ یہ غریزہ جب چاہتا ہے کہ عریان ہو تو ٹھیک ہے ہو جائے۔ اگر مرد یا عورت میں سے کوئی بھی عریان ہونا چاہے تو یہ اس کا حق ہے اور اگر آپ نے ان کو عریان ہونے سے روکا تو یہ ان کے حقوق پر تجاوز اور زیادتی ہے۔

پس ہیومینزم میں فرائض کی جگہ حقوق کی بحث آ جاتی ہے۔ ہم یہ نتیجہ گری نہیں کرتے ہیں کہ ادیان میں فقط فرائض ہیں اور حقوق نہیں ہیں۔ انسان کے صنفی حقوق، نوعی و فردی حقوق، اجتماعی و انفرادی حقوق سب کے سب دین میں موجود ہیں۔ دین کا اچھا خاصہ حصہ حقوق پر مشتمل ہے لیکن ہیومینزم کے پیروکار کہتے ہیں کہ فقط اور فقط ہیومن رائٹز کی بات کرنی چاہئے۔

......ہیومینزم میں گھریلو ماحول

دین میں والدین اور اولاد کا رابطہ فرائض اور حقوق پر مبنی ہے۔ دینی پرورده معاشرے میں یہ گفتگو ہوگی کہ والدین پر اولاد کیلئے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں ہیں اور اولاد پر والدین کیلئے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں ہیں۔ اگر دونوں اپنی ذمہ داریاں انجام دے دیں تو ایک دوسرے کی بابت حقوق بھی پیدا ہوں گے۔

لیکن ہیومینزم والے کہتے ہیں کہ فرائض کی بات کیوں کرتے ہو؟ صرف ایک بات کرو یعنی اولاد کے حقوق۔ پھر اولاد کہتی ہے کہ ہم مخدوم ہیں اور والدین صرف خدمت گزار ہیں لہٰذا آپ اولاد سے نہ کہیں کہ وہ والدین کا احترام کریں۔ نتیجتاً والدین کو بھی اپنی اولاد سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔

لہٰذا وہ تہذیب جو اس تفکر کے نتیجہ میں وجود میں آئی اس میں والدین کو حق نہیں پہنچتا کہ بچے کو کسی کام سے روکیں یا ٹوکیں۔ ان کی تہذیب میں یہ بات باقاعدہ قانون کا حصہ ہے کہ اگر کسی بھی والدین نے تربیت کے طور پر یا فریضہ ادا کرتے ہوئے اپنے بچے سے سخت بات کہہ دی تو یہ جرم ہے۔ آٹھ سال کے بچے کو والدین کی شکایات کے لئے ٹیلیفون نمبر دے دیا جاتا ہے کہ مثلاً جب بھی والدین کہیں کہ جگ سے پانی دو تو آپ فوراً ٹیلیفون کر دو، جب وہ کہیں کہ رات کو گھر میں دیر سے نہ آیا کرو تو آپ فوراً ٹیلیفون کر کے ہمیں بتا دو۔ کیوں؟ اس لئے کہ والدین کا آپ پر کوئی حق نہیں بنتا بلکہ برعکس والدین کی گردن پر آپ کے حقوق ہیں۔

دین نے کیا گھریلو ماحول فراہم کیا ہے اور سکیولرازم اور ہیومینزم نے کیا فراہم کیا ہے؟! سکیولرازم اور ہیومینزم کے مطابق ماں باپ اور اولاد ایک دوسرے پر حقوق رکھتے ہیں لیکن کوئی فریضہ نہیں رکھتے۔ صرف حقوق ہیں۔ کیوں؟ چونکہ دونوں ایک دوسرے کے غریزہ کی تسکین کے کام آتے ہیں۔ اس سے زیادہ کوئی حق نہیں بنتا۔ اور والدین پر بچوں کے حقوق طاری ہوتے ہیں۔ یہ ان کے خدمت گزار ہیں اور بچے مخدوم ہیں۔ لہٰذا اُن معاشروں میں جہاں یہ تفکر حاکم ہے خاندان کی کیا حالت ہوتی ہے؟!

سکیولر ماحول میں بس حقوق ہی حقوق ہیں! بعض خوش ہوتے ہیں کہ ابھی ہم سال میں ایک دفعہ جلوس نکالتے ہیں پھر ہم روزانہ جلوس نکالیں گے اس لئے کہ سکیولرازم اور ہیومینزم آ گیا ہے بلکہ اگر سکیولرازم

آ گیا تو آپ بچوں کے نوکر ہوں گے اور بچوں کے پاس ٹیلیفون نمبر ہوگا۔ اگر ذرا سی غلطی کی تو آپ تھانے میں ہوں گے۔ آپ کا کام فقط یہ ہوگا کہ اولاد کے غرائز کو تسکین دیں۔ اگر کسی دن بچے نے تشخیص دیا کہ اس گھر میں یہ بڑھیا اور بوڑھا ہمارے اوپر بوجھ ہیں تو اسی دن آپ کو اٹھا کر گاڑی میں بٹھا کر خانہ سالمندان میں لے جائیں گے کہ یہاں گھر میں آپ کی گنجائش نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ آپ ان کے حقوق میں رکاوٹ ہو۔ سکیولرازم میں خاندان کا تصور نہیں ہے اور جب سکیولرازم آئے گا تو تنہا تو نہیں آئے گا بلکہ اپنے خاندان اور ہمزاد سمیت آئے گا۔ جب تک ہیومینزم نہیں ہوگا اس وقت تک سکیولرازم کی بات کرنا فضول ہے۔

..........پاکستانی سرزمین کی خاصیت

پاکستان ایک ایسی سرزمین ہے کہ یہاں کلچر کے بغیر بھی بہت سی چیزیں امپورٹ کی جاسکتی ہیں اور پھر عجیب بھی لگتی ہے مثلاً ایک فوجی حکمران جمہوریت کی بات کرتا ہے۔ یہ تاریخی لطیفہ اگر کتابوں میں لکھ دیا جائے اور پھر بعد والی نسلیں آ کر پڑھیں تو بہت ہنسیں گی کہ دیکھو فوجی حکمران جمہویت کا دعویدار بن بیٹھا ہے لیکن ہمارے معاشرہ میں یہ ہوتا ہے۔ بھٹو جیسے جاگیردار ہمارے ملک میں امامِ سوشلزم کہلاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں ایک عالم دین ایک مذہبی جماعت بناتا ہے جبکہ اس کی مذہبی جماعت ہر ایک سے زیادہ سکیولر ہے۔ اسی طرح یہاں سکیولرازم کو ہمزاد سے ہٹ کر بھی امپورٹ کیا جاسکتا ہے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ پاکستان میں اچھی اچھی گاڑیاں لے آتے ہیں لیکن روڈ کی حالت دیکھیں، آخر گاڑی سے پہلے روڈ تو ہونا چاہئے، پہلے ٹریفک کا کوئی نظام تو ہو پھر گاڑی لے آئیں۔ یہاں چَ سسٹم گاڑیاں تو آ گئی ہیں لیکن کھڈوں میں چل چل کے ان کا حشر کیا ہوتا ہے! یہی حال ہر چیز کا ہوتا ہے یعنی سکیولرازم کا حال وہی ہوگا جو اس وقت ماڈرن گاڑیوں کا ہو رہا ہے۔ کھڈوں میں چل چل کے یہ تہذیب وفرہنگ استفادہ کے قابل نہیں رہے گی لہٰذا سکیولرازم سے پہلے ہیومینزم کی بات کرنی چاہئے۔ چنانچہ سکیولرازم کے متوالوں کو پہلے صاف صاف کہنا ہوگا کہ ہم خدا محور نہیں بلکہ انسان محور ہیں ورنہ منافق اسلامی سکیولر کہلائیں گے۔ پہلے

انہیں خدا کو اس سرزمین سے نکالنا ہو گا جس طرح رشین کمیونسٹوں (Russian communists) نے کہا تھا کہ ہم نے اپنی سرزمین سے خدا کو نکال دیا ہے، جس سرزمین سے خدا نکل جائے پھر وہاں ہیومینزم آ سکتا ہے، البتہ خدا کو تو سرزمین سے نہیں نکال سکتے بلکہ اپنے دلوں، اعتقادات اور عمل سے نکالو گے۔ توحید کو اپنی زندگی کا محور نہیں رکھو گے تو پھر اس کا بھیانک انجام بھی سامنے آ جائے گا۔

یہ ایک تناقض اور پیراڈکس (Paradox) ہے جسے کوئی بھی حل نہیں کر سکتا۔ یہ ایسے ہے جیسے آپ کہہ دیں کہ ایک ایسا دن ہو جس میں رات ہو۔ پس اسلام میں سکیولرازم کیسے داخل کرو گے؟! پہلے آپ کو دین کی چھٹی کرانی پڑے گی، پہلے اسلام کا دروازہ بند کرنا پڑے گا۔ ہیومینزم یعنی سب خدا ہیں اور کون نہیں چاہتا کہ میں خدا کی جگہ جا بیٹھوں۔ یہ ہیومینزم کے بدترین آثار ہیں۔

لبرل ازم (Liberalism)

2-لبرل ازم (Liberalism)

جب غرائز خدا بن بیٹھیں، غرائز دستور دیں اور باقی سب ان دستورات پر عمل کریں اس وقت انسان صحیح ہیومینسٹ (Humanist) بن سکتا ہے یعنی غرائز کی خدائی کا نام ہیومینزم ہے لیکن جب تک غرائز مکمل طور پر آزاد نہ چھوڑے جائیں اس وقت تک انسان کو ہیومینزم کا اصلی مقام میسر نہیں آتا لہٰذا غرائز کی آزادی کا دوسرا نام لبرل ازم (Liberalism) ہے یعنی غرائز کو کنٹرول کرنے کی بجائے نہیں آزاد چھوڑ دینا اور غرائز کی تسکین کے تمام مقدمات فراہم کرنا۔

کسی زمانے میں استبدادی نظام کے تحت کچھ انسان خدا بننے کا دعویٰ کرتے تھے مثلاً فرعون نے کہا: **أَنَـا رَبُّـكُمُ الْأَعْلٰى**۔[1] لیکن ہیومینزم میں ہر انسان کا دعویٰ ہے کہ **أَنَـا رَبُّـكُمُ الْأَعْلٰى**، میں اصلی خدا ہوں۔ چونکہ صاحبِ غریزہ ہے لہٰذا ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ میرے غریزہ کو تسکین ملے۔ ہر صاحبِ غریزہ دوسرے کو

---

[1]......(سورۃ النازعات/٢٤)

اپنے غریزہ کی تسکین کا ایک ذریعہ، آلہ اور پرزہ سمجھتا ہے لہٰذا لبرل ازم کے تحت اب غرائز کو آزاد کرنا پڑے گا چونکہ اگر غرائز کو پابند کر دیا تو یہ انسان پر ظلم ہوگا۔

اس تفکر کا رکن رکین یہ ہے کہ انسان کا غریزہ جتنا آزاد ہوگا وہ اتنا ہی خوش بخت اور سعادت مند ہوگا یعنی انسان کے اندر حیوانی خصلتوں کو آزاد چھوڑ دینا مثلاً کھانے پینے کے غریزہ اور شہوت رانی کی حیوانی خصلت کو آزاد چھوڑ دیں۔ جہاں سے ہاتھ آئے کھائیں اور جو جی میں آئے کریں۔ لبرل ازم، ہیومنزم کے پیٹ سے متولد ہوتا ہے۔ درحقیقت لبرل ازم ہیومنزم کی مدد کے لئے وجود میں لایا گیا۔

جب تک لوگ لبرل نہیں ہوں گے تب تک سکیولرازم کے لئے ماحول نہیں بنے گا۔ یہ خوبصورت نام دراصل جھانسے ہیں جو لوگوں کو آزادی کے نام پر دیئے جاتے ہیں۔ جیسے Landlord آ کر سوشلسٹ بن جاتا ہے اور لوگ چپ چاپ اس کے پیچھے، روٹی کپڑا اور مکان کے چکر میں لگ جاتے ہیں یا مثلاً ایک عالم دین جو دین دین کرتا ہے تو ہم یہ نہیں دیکھتے کہ خود اس کی زندگی میں دین کا کتنا عمل دخل ہے؟ سب سے پہلی چیز یہ تلاش کرنی چاہئے کہ خود کتنا دین پر عمل پیرا ہے۔ جو شخص جمہوریت، جمہوریت کرتا ہے تو دیکھو اس کا اندازِ بیان، اُٹھنا، بیٹھنا، جمہوری ہے یا نہیں؟ جمہوریت یعنی جمہور کی حاکمیت، جہاں پر لوگوں کی حکومت ہو تو لوگوں کو اس طرح مخاطب کیا جاتا ہے جس طرح آج کل یہ حکمران کرتے ہیں؟! جمہوریت میں تو جمہور حکمران ہوتے ہیں اور حکومت خدمت گزار ہوتی ہے لیکن اگر یہی جمہوریت ہے جو پاکستان میں رائج ہے تو پھر تاریخ میں جتنے مستبد گزرے ہیں وہ سب کے سب جمہوریت پسند لوگ تھے۔

اس سرزمین پر یہ کرشمے روز بروز ہو رہے ہیں یعنی غیر متدین، دین کا علمدار ہو جاتا ہے، غیر جمہوری شخص جمہوریت کا علمبردار ہو جاتا ہے اور غیر اشتراکی ذہن اشتراکیت کا علمبردار ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں میں بے شعوری ہے۔ بے شعور زمین پر بہت کچھ اُگایا جا سکتا ہے۔ اس سرزمین کی سب سے بڑی مشکل یہی بے شعوری ہے۔ مذاہب کی تفریق سے ہٹ کر، دینی مدرسوں سے لے کر یونیورسٹیز تک سب بے شعوری کے مرض میں مبتلا ہیں۔ بے شعور سرزمین پر ہی ایسے کرشمے رونما ہوتے ہیں اور ہوں گے بلکہ

اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب کام ہوں گے۔نتیجتاً آپ کو پہلے ہیومینزم سے شروع کرنا پڑے گا پھر ہیومینزم سے لبرل ازم اور لبرل ازم سے سکیولرازم تک جا پہنچنا ہوگا۔

اگر چہ لبرل ازم کو آزادی کا نام دیا گیا ہے لیکن لبرل ازم درحقیقت غرائز کی آزادی اور غرائز کی خواہشات پوری کرنے کا نام ہے مثلاً انسان کو بھوک لگتی ہے اور کھانے کا غریزہ رکھتا ہے لہٰذا لبرل ازم والے کہتے ہیں کہ کھانے کا غریزہ آزاد چھوڑ دو' پھر یہ نہ پوچھو کہ یہ کس کا مال ہے؟ جب بھوک لگی ہے تو پھر سارا مال بھوک کا مال ہے لہٰذا اس کی راہ میں جو رکاوٹ ہے اسے ہٹا دو یا مثلاً تسلط واقتدار کا غریزہ ہے تو جو رکاوٹ بنے اسے راستے سے ہٹادو۔کیوں؟اس لئے کہ رکاوٹ کون لگائے گا ؟ خدا۔ہیومینزم میں تو خدا نہیں ہوتا بلکہ یہاں تو انسان مخدوم ہے۔ یہ انسان ہے جو فیصلہ کرے گا کہ کیا ہونا چاہئے اور کیا نہیں ہونا چاہئے لہٰذا انسانی غریزے کی راہ میں ہر حائل چیز کو ہٹانے کا نام لبرل ازم ہے۔لبرل ازم میں حجاب ممنوع ہے، کیوں؟اس لئے کہ حجاب انسان کے غریزے کو اذیت پہنچا تا ہے۔لبرل انسان ہمیشہ غریزے کو تسکین دینے کے درپے ہوتا ہے لہٰذا اس رکاوٹ کو برداشت نہیں کرسکتا۔لبرل ازم کے حامی اور پیروکار دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ غریزہ کو پابند کرنا، زنجیروں میں بند کرنا انسان کے لئے بہت خطرناک ہے۔

......چڑھتے سورج کے پجاری

ہم چڑھتے ہوئے سورج کے پجاری ہیں۔جس قوم کا یہ کلچر بن جائے کہ چڑھتے ہوئے سورج کی پوجا کرنا شروع کردے تو ان کا ہر روز ایک نیا روز ہوتا ہے۔نظامی گنجوی کے بقول:

ہر دم از این باغ بری میرسد

تازہ تر از تازہ تری میرسد......[1]

---

[1]......(دیوان خمسہ- نظامی گنجوی >>مخزن الاسرار، بخش۴۸۔مقالت پانزدهم درنکوهش رشگبران)

انسان اس باغ سے ہر روز ایک نیا پھل توڑ کے کھاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں اسی طرح کا ماحول ہے مثلاً ضیاء الحق جیسا ڈکٹیٹر آئے اور اسلام کا نعرہ لگائے تو ہم اس کے پیچھے جاتے ہیں کہ اس سے بڑا دیندار تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اسی طرح جب تارڑ صاحب آئے تو ان کی داڑھی دیکھ کر لوگ ڈر گئے خصوصاً لبرل لوگ ان سے بہت ڈرے۔ کہتے تھے کہ ابھی تو ہم نے ٹی وی کو تھوڑا سا آزاد کیا ہے۔ ZTV سے ابھی تو سیکھا ہے کہ ٹی وی چینلز کیسے ہونے چاہئیں؟ پہلے تو ہم نے PTV کو مسجد بنایا ہوا تھا لیکن ابھی نیا نیا سیکھا کہ ڈرامہ کیسا ہوتا ہے؟ فلم کیسی ہوتی ہے؟ کہ اسی اثناء میں یہ داڑھی والا پریذیڈنٹ آ گیا ہے۔ اب کیا بنے گا؟

لیکن اس پریذیڈنٹ نے آ کر کیا کہا؟ اس کا سب سے پہلا صدارتی بیان یہ تھا کہ ڈرو نہیں! میں بھی لبرل ہوں۔ واقعاً وہ لبرل تھے۔ لبرل کا معنٰی یہی ہے کہ میں تمہارے غرائز میں رکاوٹ نہیں ہوں بلکہ میں خود بھی صاحبِ غریزہ ہوں البتہ ممکن ہے تمہیں کسی اور غریزے نے ستایا ہو اور مجھے کسی اور غریزہ نے۔ میں اقتدار کے غریزہ میں جکڑا ہوا ہوں اور تم کسی اور غریزے میں مبتلا ہو گے۔ پس سکیولرازم کے لئے لبرل ازم ضروری ہے ورنہ سکیولر سٹیٹ نہیں بن سکتی۔

3-پلورل ازم (Pluralism)

تیسری چیز جو سکیولرازم کے لئے ضروری ہے وہ پلورل ازم ہے البتہ پلورل ازم ہیومینزم کا فرزند ہے۔ ہیومینزم اس کے لئے ماں کی حیثیت رکھتا ہے۔ پلورل ازم سے مراد یہ ہے کہ صراط مستقیم ایک نہیں ہے بلکہ صراط ہای مستقیم ہیں اور یہ سب کے سب صراط مستقیم ہیں، سب راستے صحیح ہیں۔ سکیولرازم کو اختیار کرتے ہوئے یہ سارے مراحل طے کرنے ہوں گے۔ تیسرے مرحلے پر پلورل ازم آتا ہے کہ اب جب دین ایک شعبۂ حیات ہے اور غرائز بھی آزاد ہیں تو مرضی ہے کہ جس دین کو بھی اختیار کیا جائے، جو بھی مسلک اور مذہب اختیار کریں وہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ تمام کے تمام مذاہب اور مکاتب درست ہیں۔ یہ کہنا کہ اتنے سارے راستوں میں سے ایک ہی صراط مستقیم ہے یہ انحصار طلبی ہے بلکہ ہر راستہ مستقیم ہے، ہر چیز مستقیم ہے، دُمِ سگ بھی مستقیم ہے حالانکہ

سب جانتے ہیں کہ کتے کی دُم ٹیڑھی ہوتی ہے۔

آپ جنگلی کام کر رہے ہوں وہ بھی مستقیم ہے، کسی کو قتل کر رہے ہوں یہ بھی مستقیم ہے، چور ہوں تو بھی مستقیم ہیں، مظلوم ہوں تو بھی مستقیم ہیں اور ظالم ہوں تو بھی مستقیم ہیں۔ خدا کی عبادت کریں یا بتوں کی پوجا کریں ہر راستہ سیدھا ہے، جس راستے سے بھی آؤ پہنچنا یہیں ہے اس لئے تمام راستے مستقیم ہیں۔ یہ تفکر سکیولرازم کی سب سے بڑھ کر حمایت کرتا ہے۔

سکیولرازم، سب کچھ گنوادینے کا نتیجہ

سکیولرازم، سب کچھ گنوادینے کا نتیجہ

پس ہیومینزم، لبرل ازم اور پلورل ازم یہ پورا خاندان جب ملے گا تو اس کے پیٹ سے کوئی بچہ پیدا ہوگا اور وہ سکیولرازم ہے۔ یہ اس سارے ماحول کا نتیجہ ہوگا۔ صرف ایک بینر لگانے یا کسی کی ایک تقریر سننے سے انسان سکیولر نہیں بنتا بلکہ سکیولرازم کے لئے اتنا کچھ ہاتھ سے دینا پڑے گا، سکیولرازم قربانیاں مانگتا ہے جیسے ہر مکتب قربانیاں مانگتا ہے ورنہ آسانی سے سکیولر بننا ممکن نہیں۔

بے شعور سرزمین کا المیہ

ایک صاحب کسی شخصیت کا واقعہ سنا رہے تھے کہ ہمارے علاقے میں ایک شخصیت تھی جس کو ہم اچھا نہیں سمجھتے تھے لہٰذا ہم نے اپنے علاقے میں سب فقیر لوگوں کو اس کے بارے میں بتایا ہوا تھا کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے کیونکہ اس کی زندگی بہت سی ہی مرّفہ ہے۔ انسان کی ایک گاڑی ہوتی ہے لیکن اس کے پاس چار چار گاڑیاں ہیں، انسان کو ایک گھر کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کے پاس زیادہ گھر ہیں، اتنے نوکر ہیں، غرضیکہ بہت ہی مرفہ زندگی بسر کر رہا ہے۔

اور یہ واضح سی بات ہے کہ جب فقراء کے سامنے ایسی باتیں کی جائیں کہ دیکھو تمہارے پاس تو کھانے کے لئے کچھ نہیں لیکن اس کے پاس ضرورت سے بھی کئی گنا زیادہ ہے تو فقیروں کو ایسے افراد سے نفرت

ہوجاتی ہے۔ جیسے ستم رسیدہ لوگوں کے سامنے ظالم اور ظلم کا تذکرہ کروتو انہیں ظالم سے نفرت ہوجاتی ہے لہٰذا اس شخصیت کا بھی ہم نے یہی تعارف کروایا تھا کہ وہ اچھا انسان نہیں ہے۔

ایک دفعہ وہ شخصیت کسی مناسبت سے اپنے اسی کروفر کے ساتھ آ گئی کہ جس طرح ہمیشہ آتی تھی مثلاً پورے لاؤلشکر کے ساتھ آئی، بہت سے باڈی گارڈز اسلحہ لے کر اس کے ساتھ آئے ہوئے تھے اور چار پانچ گاڑیاں اس کے آگے پیچھے جا رہی تھیں۔ جب اس کی یہ کروفر اور شان وشوکت دیکھی تو وہی لوگ جن کو ہم نے اس کے متعلق بدبین کیا ہوا تھا اس کے سامنے تسلیم ہوگئے۔ کہا کہ اتنی بڑی اور اتنی شان وشوکت والی شخصیت تو ہم نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ آپ خوامخواہ کہتے ہیں کہ یہ ایسے ویسے ہیں لہٰذا یہ بے شعور سرزمین کا المیہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے جو چیز بھی پیش کریں گے تو وہ کچھ اور ہی رنگ وشکل اختیار کریں گے۔

آپ اگر ظالم کو ظالم پیش کریں گے تو وہ اس کو ہیرو سمجھیں گے۔ بے شعور سرزمین پر کہو کہ اس نے اتنا قتل عام کیا ہے تو وہ حیران ہوں گے کہ اس کا مطلب ہے یہ بہت بڑا بہادر اور جرأت مند انسان ہے۔ اگر بے شعور سرزمین پر خبروں میں سنا جائے کہ ہم نے اتنے ٹن بم ایک سرزمین پر پھینکے کہ ہمارا اسٹاک ختم ہوگیا تو لوگ کہیں گے کہ ان کے پاس کتنی بڑی ٹیکنالوجی ہے!! بے شعور سرزمین ہر چیز کا نیا معنٰی سمجھتی ہے۔

اسی طرح انہوں نے بے شعوری سے فائدہ اٹھایا اور اپنے مکاتب کو آزادی، فریڈم، انسان دوستی اور جمہوریت جیسے ناموں کے لیبل لگا کے پیش کیا۔ بے شعور لوگ بھی ان ناموں کی زد میں آ کر ان کے ہمنوا ہوگئے۔ درحقیقت یہ ہماری بے شعوری کو دور کرنے کے بجائے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

بے شعور سرزمین پر ہی یہ سوچ پروان چڑھتی ہے کہ دیندار حکومت میں ہر فرقہ خوش نہیں رہ سکتا بلکہ اس طرح معاشرے میں نفرتوں اور دشمنیوں کا اضافہ ہوجاتا ہے لہٰذا لادین حکومت اس مسئلہ کا حل ہے۔ ان سے کہنا چاہئے کہ یہ ایسا ہی راہِ حل ہے کہ جیسے بہت سارے مریض ہسپتالوں میں پڑے ہوں، ڈاکٹرز اور دوائیوں کی کمی ہو تو ایک بہترین راہِ حل یہ ہے کہ سب کو زہر کا ٹیکہ لگا دیں۔ اس طرح ہسپتال خالی ہوجائیں گے اور مسئلہ حل ہوجائے گا لہٰذا ان مسائل سے نمٹنے کے لئے سکیولرازم کو لانا کوئی راہِ حل نہیں ہے بلکہ یہ تو دین

کے ساتھ مذاق ہے۔ بے شعوری انسان کو انحرافی راہِ حل تلاش کرنے پر مجبور کرتی ہے اور اسی بناء پر سامری اپنی کاریگری دکھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

......سامریت، بے شعوری سے فائدہ اٹھانے کا نام

جو بھی لوگوں کی بے شعوری سے فائدہ اٹھانا چاہے وہ سامری ہے، خواہ وہ دین کے نام پر ہو یا کسی اور نام پر۔ سامری گری بے شعوری دور کرنے کا نام نہیں بلکہ لوگوں کی بے شعوری سے فائدہ اٹھانے کا نام ہے۔ چونکہ عام لوگ تجزیہ و تحلیل نہیں کر سکتے اور حقائق کو درک نہیں کر سکتے۔ آئے دن ان کی نافہمی اور بے شعوری سے فائدہ اٹھانا سامریت کا پرانا دھندہ ہے۔

اگر انسانی کام کرنے ہیں، اگر انسانیت پر جنایت نہیں کرنا چاہتے تو لوگوں کی بے شعوری کو دور کریں۔ بے شعوری سے فائدہ اٹھا کر اپنی من پسند چیز پر آزادی کا لیبل لگا کر پیش کی جانے والی آزادی ہزاروں غلامیوں سے بدتر ہے۔ اگر یہ آزادی ہے تو اس سے کئی درجہ بہتر غلامی ہے۔ اگر یہ آزادی ہے کہ انسان غرائز کا اسیر و پابند غرائز بن جائے تو غلامی کس چیز کا نام ہے؟! اس پر غور و فکر کریں کہ انہوں نے کس طرح سے انسانی زندگی کا مسیر تبدیل کر دیا۔

پیدائشی طور پر فطرتِ انسانی کا رخ خدا کی طرف ہے لیکن انہوں نے اسے موڑ کر غرائز کی طرف کر دیا۔ ان تہذیبوں میں جہاں سکیولرازم کو پروان چڑھا گیا اور ہیومینزم کی جڑیں مضبوط ہوگئی ہیں، غرائز کی تسکین کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگر وہاں علمی کام ہو رہا ہے تو وہ بھی اس لئے کہ اس کی مدد سے غرائز زیادہ سے زیادہ اچھے طریقے سے تسکین پاسکیں۔ انہوں نے بے شعوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آزادی کے نام پر سائنٹفک اور مصنوعی طریقوں سے انسانی ذہنوں کو اسیر و غلام بنالیا ہے۔ آزادی بہت ہی خوبصورت لفظ ہے اور انسان کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ انسان فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے۔ یہ حضرت امام علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

وَ لَا تَکُنْ عَبْدَ غَیْرِکَ وَ قَدْ جَعَلَکَ اللّٰہُ حُرًّا......[1]

دوسروں کے غلام نہ بن جاؤ جب کہ اللہ نے تمہیں آزاد بنایا ہے......

غلامی کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔کبھی کسی کے پاؤں میں بیڑی ہوتی ہے یہ جسمانی اسیری ہے۔ جسمانی اسیر روحانی طور پرآزاد ہوتے ہیں جیسے کہ حضرت امام سجادعلیہ السلام کی گردن میں طوق تھا لیکن جب یزید جیسے فاسق ،فاجراور سفاک قاتلِ اہل بیت علیہم السلام کے سامنے گئے تو ساری دنیا نے آزادی کا مظاہرہ دیکھا۔ گلے میں طوق پڑا ہوا ہے لیکن آپ علیہ السلام کی زبان آزادی کا درس سکھاتی ہے۔اسی طرح خواتین کواسیر کر کے دربار میں ان کے سامنے کھڑا کر کے جب اس نے طعنہ دینا شروع کیا تو ان اسیروں نے اس فاسق وفاجر کو کیسے رسوا کیا اور کس بے باکی سے اس کے سامنے بولے۔اگر چہ گردنوں میں طوق تھے لیکن ان کی زبانیں آزاد تھیں۔اسی فاسق کے دربار میں بہت سارے ایسے لوگ تھے جن کی گردنوں میں طوق تو نہیں تھے لیکن ان کے ہونٹوں پر تالے تھے اور زبانیں غلام تھیں لہٰذا دین سب سے زیادہ آزادی کا درس دیتا ہے۔

انسان کیلئے غلامی سب سے بری چیز ہے لیکن اگر انسان غلام خدا بن جائے تو اس میں انسانیت کی معراج وتکمیل ہے۔ جسے ایک سجدہ گران پڑتا ہے، جوایک ذاتِ خدا کا غلام نہیں بنتا اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ میں بندگئ خدا نہیں کرتا اسے ہزاروں چھوٹے بتوں کی بندگی کرنی پڑتی ہے۔اس کی غلامی بدترین غلامی ہے۔

پس کچھ لوگ عمداً اور قصداً ایسے مکاتب وجود میں لائے جوسکیولرازم کے لئے میدان ہموار کرتے ہیں۔یعنی سکیولرازم کے آنے سے پہلے یہ مکاتب معاشرے میں حاکم ہوں گے۔انسانی فطرت پرٹھونسے گئے ان تفکرات کے نتیجہ میں جو ماحول ان معاشروں میں پیدا ہوا ان کی ابتر حالت ہمارے سامنے ہے۔

---

[1]......(نهج البلاغه،وصيت نامه،مكتوب ۳۱)

فصل ششم

سکیولرازم کے مقابل متعہد مسلمان کا فریضہ

سکیولرازم کے خلاف قیام

سکیولرازم کا موضوع ہم نے اس لئے نہیں چھیڑا تھا کہ یہاں فقط علمی موازنہ اور محض پیشہ وارانہ علمی بحث کی جائے یعنی جس میں غرض نہ ہو کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ مقصود یہ تھا کہ ہم ایک متعہدانہ بحث کریں کہ اسلام کے اوپر یہ جدید تہاجم و جدید یلغار سکیولرازم کے نام سے حملہ آور ہوئی ہے تو ہم اسے سمجھیں اور دیکھیں کہ اس کا خطرہ کتنا سنجیدہ و جدی ہے اور ہم اس خطرے سے کس حد تک اسلام کا دفاع کر سکتے ہیں۔

ہمارا مقصد یہ بھی نہیں تھا کہ موضوع اختتام تک پہنچ جائے بلکہ مقصود صرف اس کو شروع کرنا تھا کہ یہ موضوع چھڑ جائے اور پھر ہم سب اس پر مزید تحقیق و بحث کریں، اس کے عوامل، پیچیدگیوں اور نقصانات پر غور وفکر کریں، سکیولرازم کے مقابل مؤثر قیام کریں، اسلام کو بھی سمجھیں اور اسلام کے مقابل، رقیب اور حریف نظریات کو بھی سمجھیں، انہیں پڑھیں اور پڑھنے کے بعد احسن کا انتخاب کرلیں۔ قرآن کریم نے بھی یہی راہنمائی کی ہے:

فَبَشِّرْ عِبَادِ ○ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُولٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللّٰهُ وَأُولٰئِكَ هُمْ أُولُوا الْأَلْبَابِ○......[1]

پس آپ میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجئے۔ جو بات کو سنا کرتے ہیں اور اس میں سے بہتر کی پیروی کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی صاحبانِ عقل ہیں۔

یہ قرآنی رویہ اور طریقہ ہے کہ سن کے، پڑھ کے اور سمجھ کے اپنے لئے بہترین کو چن لو۔ یہ نہ ہو کہ جو بھی بات سنو تو کہو یہی احسن القول ہے۔

---

[1]......(سورۂ زمر/۱۸-۱۷)

جیسے یہ واقعہ مشہور ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان بکری پر جھگڑا تھا تو دونوں قاضی کے پاس چلے گئے۔ ایک نے کہا: قاضی صاحب یہ بکری میری ہے۔ قاضی نے کہا تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟ اس نے اپنی دلیلیں پیش کیں تو قاضی نے دلیلیں سننے کے بعد کہا ٹھیک ہے آپ صحیح کہتے ہیں یہ بکری آپ کی ہے۔ یہ فیصلہ سنتے ہی دوسرا شخص اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا: قاضی صاحب آپ نے یک طرفہ فیصلہ کیا ہے، یہ بکری میری ہے۔ قاضی نے کہا: آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟ اس نے بھی اپنی دلیلیں قاضی کے سامنے پیش کیں تو قاضی نے کہا: ہاں! آپ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ بکری آپ کی ہے۔ وہاں کوئی اور شخص اٹھ کر کہنے لگا کہ قاضی یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ ایک بکری دونوں کی ہو؟! قاضی نے کہا۔ ہاں!! آپ بھی درست کہہ رہے ہیں، ایک بکری تو دو آدمیوں کی نہیں ہوسکتی لہٰذا انسان ایسا نہ ہو کہ جو بھی بات سنے تو فوراً کہے کہ یہی بہترین ہے بلکہ اس میں یہ صلاحیت ہو کہ ان میں سے بہترین کا انتخاب کر سکے۔

سکیولرازم کے خلاف قیام کی نوبت اس وقت آئے گی جب ہم دشمنانِ اسلام کے پیدا کردہ نظریات کو اچھی طرح پہچانتے ہوں اور ان کے مقاصد سے بھی باخبر ہوں لیکن سب سے اہم چیز یہ ہے کہ پہلے ہم خود اپنے دینِ اسلام کی حقیقی معرفت رکھتے ہوں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوں۔

اسلام اور مسلمان میں فرق

المیہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات سے دوری کے سبب آج اسلام اور مسلمان میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ اگرچہ اسلام میں سکیولرازم اور اس کے ہمزاد مکاتب کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن مسلمانوں میں ان کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ مسلمانوں پر غریزی تہذیب ٹھونسی جاسکتی ہے اور ٹھونسی گئی ہے۔ خصوصاً میڈیا کے ذریعے مغربی افکار و ثقافت کی مسلسل بمبارڈمنٹ (Bombardment) کے باعث اکثر مسلمان مغربی تہذیب کو من وعن قبول کر چکے ہیں۔ آج اگر آپ کسی مغربی ملک میں جائیں یا کسی مسلمان مملکت میں تو ان میں کوئی زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا ہے۔

مرحوم علامہ اقبالؒ نے غالباً پیرس کی مسجد دیکھ کر یہ اشعار کہے:

مری نگاہ کمال ہنر کو کیا دیکھے
کہ حق سے یہ حرم مغربی ہے بیگانہ
حرم نہیں ہے، فرنگی کرشمہ بازوں نے
تن حرم میں چھپادی ہے روح بت خانہ
یہ بتکدہ ان ہی غارتگروں کی ہے تعمیر
دمشق ہاتھ سے جن کے ہوا ہے ویرانہ......[1]

مفہوم یہ ہے کہ دمشق نے مغربیوں کی تحویل میں بہت کچھ دیا۔ دمشق سے مراد قدیم سوریہ اور شام ہے جس کو شامات کہا جاتا ہے۔ لبنان، فلسطین ،اردن وغیرہ یعنی موجودہ چار پانچ ملک اس قدیمی شام میں شامل تھے۔علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اس شام کی تہذیب نے مغرب کو تورات دی، موسیٰؑ دیئے، انجیل دی، عیسیٰؑ دیئے، معنویت اور خدا پرستی دی۔آج اگر مغرب میں کوئی مذہب ہے تو سوریہ کی وجہ سے ہے۔ یہ سارے ادیان شام میں پیدا ہوئے اور شام نے ان ادیانِ توحیدی کو مغرب کی تحویل میں دیا لیکن مغرب نے شام کو کیا دیا؟! فقط غریزے کی عریانیت، مرد وعورت کی عریانیت، بے حجابی، بے بندوباری اور لاابالیت دی۔

مغرب سے غریزے کی اٹھی ہوئی تحریک آج سوریہ میں صاف نظر آتی ہے لہٰذا آپ کسی بھی اسلامی ملک میں چلے جائیں تو یوں لگتا ہے کہ یہ اسی غریزی تہذیب کا ایک محلّہ اور کالونی ہے لہٰذا مسلمان اور سکیولرازم ایک ملتی جلتی بات ہے۔ اگر غیر مسلم اسلام کے بارے تحقیق کر کے مسلمان ہونا چاہے تو اس کے اور اسلام کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ اگر اتنی نہ ہو تو اس سے کم بھی نہیں ہے کہ جو مسلمان اور اسلام کے درمیان خلیج ہے۔ کہاں اسلام اور کہاں مسلمان ؟! مسلمان، اسلام سے بہت زیادہ فاصلے پر ہیں جبکہ ہزاروں میل دور

---

[1]......(ضربِ کلیم،صفحہ ۱۱۵)

واقع مغربی تہذیب وافکار سے بہت مانوس ہورہے ہیں۔

تہذیبیں، جغرافیائی حدود سے آزاد

بعض تہذیبیں کچھ جغرافیوں سے منسوب ہوجاتی ہیں لیکن تہذیبوں کی کوئی جغرافیائی حدود نہیں ہوتیں۔ کسی بھی سرزمین پر پیدا ہونے والی تہذیب میں اگر انسانی اقدار (Values) پائی جاتی ہوں تو وہ ایک انسانی تہذیب ہوتی ہے چاہے ایک سرزمین سے دوسری سرزمین پر منتقل ہوجائے۔ اس وقت تہذیبوں کی جنگ کے جو تذکرے ہیں، کلچرل وار کا جو نعرہ ہے اور بڑے بڑے مفکرین بڑے فخر کے ساتھ اس کی ترویج کرتے ہیں وہ بھی اسی بناء پر ہے کہ تہذیبیں سرحدوں میں نہیں ہوتیں بلکہ ہمیشہ سرحدیں عبور کر جاتی ہیں۔

جیسے بہت ساری تہذیبیں سرحدیں عبور کر کے ہمارے ملک میں آچکی ہیں اور انہوں نے ہمارے دل ودماغ کو تسخیر کرلیا ہے۔ آج ہمارا رہن سہن، اٹھنا بیٹھنا، آداب ورسوم اور طرز زندگی سب کچھ دوسری تہذیبوں سے متاثر ہے۔ اگر کوئی باہر سے پاکستان آئے اور ہمارے ماحول کو دیکھ کر یہ سمجھنا چاہے کہ ہمارا کلچر کیا ہے تو اسے سمجھ میں نہیں آئے گا کہ یہ شتر ہیں یا مرغ ہیں۔ شتر مرغ اسی کو کہتے ہیں اگر اسے کہو کہ انڈا دو تو کہتا ہے میں شتر ہوں، اگر اس سے کہو کہ بوجھ اٹھاؤ تو کہتا ہے میں مرغ ہوں۔ ہمارے ہاں شتر مرغی تہذیب ہے اس لئے ہماری سرزمین بہت ساری تہذیبوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔

تہذیبیں، جغرافیائی حدود سے آزاد

اسلام فہمی کیلئے منظم و مسلسل اہتمام کی ضرورت

پس مغربی تہذیب وافکار سے مقابلہ کیلئے ہمیں سب سے پہلے اسلام سے آگاہی اور اسلام کی بنیادوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے لیکن اس کیلئے جو طریقۂ کار ہم نے اختیار کیا ہوا ہے وہ انتہائی ناموزوں ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اسلام سمجھنے کے لئے ایک دو مجلسیں، ایک دو دروس اور ایک دو وعظ ونصیحت سن لینا کافی ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ دینی معلومات اور دینداری میں بہت فرق ہے۔ دینداری اس چیز کا نام نہیں کہ

ہمارے ذہن میں تھوڑی سی معلومات آجائیں۔ ہر مسلمان کو دیندار ہونا چاہئے ورنہ بے دین مسلمان، مسلمان نہیں ہوتا اور دیندار بننے کے لئے اسلام کو سمجھنا ضروری ہے۔دراصل اسلام کو اپنے اصلی منابع سے سمجھنا چاہئے۔اسلام کا سب سے اہم منبع قرآن کریم ہے اسی طرح دیگر منابع بھی ہیں مثلاً سنت، اجماع اور عقل۔

اسلام کو اپنے منابع سے سمجھنے کے لئے ہمیں کم از کم اتنا اہتمام کرنا چاہئے جتنا ہم معمولی علم کو سیکھنے کے لئے کرتے ہیں حتیٰ کہ ایک زبان سیکھنے کے لئے انسان کو ایک مدت لگانی پڑتی ہے اسی طرح کم از کم اتنا اہتمام اسلام سیکھنے کے لئے کرنا چاہئے جتنا کسی زبان سیکھنے کیلئے کرنا پڑتا ہے۔ورنہ چند ایک باتیں ادھر اُدھر سے سن لینے پھر فقط محرم کے دس دنوں میں مجالس میں شرکت کر لینے سے ہمیں پورا اسلام سمجھ میں آجائے گا؟ یہ ممکن نہیں ہے اور نہ ہی آج تک کسی نے یہ معجزہ کر دکھایا ہے کہ چند محفلوں اور چند مجلسوں میں بیٹھ کر اسلام سمجھ گیا ہو۔تاریخ میں تو ابھی تک ایسا کوئی معجزہ رونما نہیں ہوسکا۔

اسلام فہمی کیلئے ہمیں کم از کم اتنا اہتمام کرنا چاہئے جتنا ایک معمولی اسکول میں ریاضیات، فزکس، کیمسٹری وغیرہ کو اہمیت دیتے ہیں اور ان کو سمجھنے کے لئے وقت دیتے ہیں۔میں سنی سنائی بات نہیں کرر ہا ہوں بلکہ ایک ایسے تجربہ کی بات کرر ہا ہوں جس میں ایک عمر میں نے صرف کی ہے۔لگ بھگ بیس سال سے میں اس شعبہ میں کام کرر ہا ہوں، ابھی بھی میں اسلام کا ایک مبتدی طالب علم ہوں لہٰذا اسلام سمجھنے کے لئے بہت زیادہ وقت چاہئے۔ایک بہت ذہین انسان جو ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت محنتی بھی ہو اور محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ صبور اور بردبار بھی ہو وہ اپنی عمر کا اچھا خاصہ حصہ لگائے تو پھر اس کو اسلام سمجھ میں آتا ہے۔

اسلام فہمی کیلئے منظم و مسلسل اہتمام کی ضرورت

اگرچہ ہمارے مفتیان صاحبان ایک شب، ایک گھنٹہ دیئے بغیر اسلام کے مفتی بنے ہوئے ہیں یعنی یہاں ہر آدمی مفتی بن بیٹھا ہے۔کسی دوسرے شعبے میں بات کریں مثلاً بجلی کا فیوز لگانا نہیں آتا لیکن اسلام میں فتویٰ دینا آتا ہے۔ وہاں ڈر سے ہاتھ نہیں لگاتا کہ کہیں گھر کا تار اور بجلی خراب نہ ہو جائے لیکن اسلام میں آکر فیوز لگاتا ہے۔خدا شاہد ہے کہ اسلام سمجھنا اتنی سادہ سی بات نہیں ہے۔

دنیا کے ہر علم سے مشکل یہی اسلام سمجھنا ہے۔ یہ ایک پراسیس سے گزر کر کہہ رہا ہوں، کسی حدتک

دوسرے علوم بھی پڑھے ہیں اور دوسرے علوم کے پڑھنے والوں کو بھی کسی حد تک جانتا ہوں کہ وہ کس طرح سے پڑھتے ہیں۔ بے شک آپ بھی چیک کر کے دیکھ لیں کہ علوم کا مشکل ترین شعبہ یہی علوم اسلامی ہیں۔

آپ اسکول، کالج و یونیورسٹی میں مختلف علوم پڑھتے ہیں اور پھر ان کا امتحان لیا جاتا ہے۔ اگر ایک ہزار افراد امتحان میں شریک ہوتے ہیں تو کم از کم نو سو کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن علم دین میں اگر ایک ہزار انسان امتحان دیں تو مشکل سے دس آدمی کامیاب ہوتے ہیں لہٰذا اسلام فہمی کی اشد ضرورت ہے البتہ سیمینارز، محافل اور مجالس بھی اسلام فہمی میں مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

اسلام کی تلاش!

حضرتِ امام خمینیؒ کا فرمان ہے:

مسلمین باید اسلام را پیدایش کنند، اسلام از دست شان فرار کردہ۔ ما الان اسلام را نمی دانیم چیست۔ اینقدر بہ مغز ما خواندہ است این غرب و این جنایتکارھا کہ اسلام را ما گمش کردیم۔ تا اسلام را پیدا نکنید نمی توانید اصلاح بشوید......[1]

مسلمانوں کو چاہیئے کہ اسلام کو تلاش کریں کیونکہ اسلام ان کے ہاتھوں سے فرار کر چکا ہے۔ ہم ابھی اسلام کو نہیں جانتے کہ اسلام کیا ہے؟ غرب اور جنایتکاروں نے ہمارے ذہن میں ایسے افکار بٹھائے کہ ہم اسلام ہی کو گم کر بیٹھے۔ جب تک اسلام کو دوبارہ تلاش نہیں کریں گے اپنی اصلاح بھی نہیں کر سکیں گے......

امام خمینیؒ یہ جملہ اہلِ مدرسہ، اہلِ مسجد، اہلِ محراب اور اہلِ علم سے کہہ رہے ہیں یعنی اتنے مدرسے، اتنی مسجدیں، اتنے علمی ادارے اور اتنی کتب لکھی جانے کے باوجود ایک فقیہ اٹھ کر نعرہ لگاتا ہے کہ تمہارا اسلام گم

---

[1]......(صحیفہ نور-امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ)

ہوگیا ہے تو یہ ایک واقعیت ہے۔آج اسلام کے نام پر کیا کیا ہورہا ہے؟!

ہم ایک دفعہ کسی جگہ گئے کہ جہاں کیلا اتنا زیادہ نہیں پایا جاتا تھا۔یعنی پیدا بھی نہیں ہوتا اور وہاں کی تہذیب وثقافت میں یہ فروٹ شامل نہیں تھا لیکن کبھی کسی دوسرے ملک سے چلا جاتا ہے تو وہاں کے لوگوں کو کیلا کھاتے ہوئے ہم نے خود دیکھا ہے۔بعض کو چھلکے سمیت کھاتے ہوئے دیکھا ہے لیکن ایک عجیب منظر جو دیکھنے میں آیا وہ یہ تھا کہ جس طرح ہم کھجور کھاتے ہیں اور گٹھلی نکال کر پھینک دیتے ہیں تو انہوں نے بھی کیلے کو کھجور سمجھ کر کھایا۔یعنی کیلے کے چھلکے اتار کر کھالئے اور اندر جو گٹھلی سی ہوتی ہے اسے پھینک دیا۔

ہم یہی کام اسلام کے ساتھ کررہے ہیں۔ہم نے اسلام کی گٹھلی پھینک دی اور چھلکا تناول کررہے ہیں۔یہ ہنسنے کی بات نہیں بلکہ رونے کی بات ہے۔یہ یہی مطلب ہے کہ اسلام گم شدہ است۔فقط مصلّی پر تسبیح لے کر محراب میں بیٹھ جانا اور اپنی حور کے چکر میں پڑے رہنا تو اسلام نہیں ہے۔اسلام دینِ حیات، دینِ سماج، دینِ سیاست، دینِ حکومت، دینِ فطرت، دینِ معیشت اور دینِ عبادت ہے یعنی عبادت کے ساتھ ساتھ یہ ساری چیزیں ہیں لہٰذا ''پیدا ایش کنند''،اسے ڈھونڈیں۔

روحِ اسلام، مرکزِعافیت

اگر ہم اپنے اعمال کا تجزیہ کرنا چاہیں کہ ہمارے اعمال واقعاً اسلامی اعمال ہیں یا نہیں تو یہ دیکھیں کہ ان میں روحِ اسلام ہے یا نہیں۔ہماری عبادتیں روحِ عبودیت سے خالی ہیں اور یہ ایک واقعیت ہے۔جب کوئی روحِ اسلام کو پہچان لے تو غلط وسوسے نزدیک نہیں آتے۔جیسے کہتے ہیں:

خلوتِ دل نیست جایِ صحبتِ اضداد
دیو چو بیرون رود فرشته در آید......[1]

---

[1]......(دیوان حافظ شیرازی،از روی نسخهٔ تصحیح شدهٔ علامه محمد قزوینی،غزل۲۳۲،صفحه۱۸۲)

ہمارے وجود سے پہلے دیو نکل جائے پھر فرشتہ داخل ہوتا ہے۔ یہ وسوسے نکلیں گے تو اسلام آئے گا۔اس لئے عرض کیا کہ مرکزِ اسلام میں آجائیں۔ باؤنڈری پر رہیں گے تو وسوسوں سے دوچار ہوجائیں گے۔ باؤنڈری پر آپ کا ریڈیو کوئی اسٹیشن پکڑتا ہے، دشمن کا بھی پکڑتا ہے اور اپنا بھی لیکن اگر آپ مرکز میں ہوں گے تو صرف اپنا چینل پکڑے گا۔غلط چینلز کی آواز پر کان دھرتے رہے اور صحیح یا غلط بات میں تمیز دینے کی صلاحیت بھی نہ ہو تو اس کا نتیجہ وسوسے ہوں گے۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ انسان باؤنڈری کراس کرکے اندر قدم رکھے ورنہ جو انسان باؤنڈری پر ہے وہ دائرہ سے باہر ہوتا ہے لہٰذا ناجی اور نجات یافتہ وہ ہے جو دائرے کے سینٹر میں ہے باقی سب خطرے میں ہیں۔

اسلامی تعلیمات سے دوری کے ذمہ داران

اگر آج اسلامی معاشرے میں لوگ اسلام سے دور ہورہے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فقط مبلغینِ اسلام کی کوتاہی ہے بلکہ کچھ نہ کچھ اسلام جو نظر آرہا ہے یہ بھی مبلغینِ اسلامی کے مرہونِ منت ہے۔ حضرت امام خمینیؒ کا بہت زرین قول ہے کہ اگر آپ کسی معاشرے میں لوگوں کو بہت دیندار پائیں اور ان میں دین کی طرف رغبت پائیں تو جان لینا کہ یہاں پر اچھا اور باکردار عالمِ دین ضرور رہا ہے لیکن اگر دیکھیں کہ لوگ دین سے بہت بیزار ہیں تو یقین کرلینا کہ یہاں کوئی بدکردار عالم آیا ہے یا کوئی عالم یہاں آیا ہی نہیں ہے۔

مسیحیت اور اسلام میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ مسیحیت میں تمام تر ذمہ داری چرچ اور پاپ کی گردن پر ڈال دی گئی کہ وہ مسیحیت کو سنبھالیں لیکن اسلام نے سب کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ......[1]

---

[1]......(مرآة العقول فى شرح أخبار آل الرسولؑ- العلامة المجلسیؒ،الجزء۸،صفحه ۳۴۹)

(تفسیر المراغی-أحمد مصطفٰی المراغی،الجزء۱،صفحه ۴۰۹)

تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داریوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

پس اگر اسلام کا تعارف نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ نہیں فقط مبلغِ اسلام کا گریبان پکڑا جائے گا بلکہ ہر فرد کا گریبان پکڑا جائے گا۔ اسلامی تعلیمات کی ترویج کو واجب کفائی کہا گیا ہے اور واجب کفائی فرد پر واجب ہوتا ہے۔ اگر تمہارے معاشرے میں کوئی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی ترویج کرے تو تم خود اہتمام کرو لہٰذا یہ کہنا کہ مبلغین، علماء یا ایک خاص طبقہ کام نہیں کر رہا ہے یا یہ فقط علماءِ اسلام کا فریضہ ہے، یہ اپنے آپ کو تسلی دینا ہے تاکہ بات ہم سے ٹل جائے۔ سب کو احساس ذمہ داری ہونا چاہئے۔ یہ فرد فرد کا وظیفہ ہے۔

سب سے بڑھ کر علماءِ اسلام کا وظیفہ ہے کہ وہ اسلام کی صحیح تبلیغ کریں۔ یہ حقیقت ہے کہ جس طرح عیسائی پادری مسیحیت سے لوگوں کی بیزاری کا باعث بنے اسی طرح بدکردار مسلمان عالم بھی اسلام سے لوگوں کی دوری کا ایک سبب ہیں۔ امام خمینیؒ کی نظر میں سب سے بڑا طبقہ جس نے اسلام کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا درباری علماء کا طبقہ ہے۔ صدرِ اسلام سے لے کر آج تک درباری علماء نے اسلام کو بہت نقصان پہنچایا ہے حتیٰ کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے قتل کا فتویٰ ایک درباری عالم نے صرف پیسوں، مقام اور شہرت کی خاطر دیا۔ درباری عالم اسلام تک بیچ کھاتا ہے۔ بقول حضرتِ اقبالؒ:

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذر و دلقِ اویس و چادرِ زہراؑ!......[1]

بیداری کی ضرورت

پس ہماری سرزمین پر سکیولرازم کیلئے بہت خطرناک کوششیں کی جا رہی ہیں کہ جن کی ہمیں خبر تک نہیں ہے کہ کیا ہو رہا ہے؟ اور کیا ہونے والا ہے؟ جبکہ ہم خوش فہمیوں میں مبتلا اور غفلتوں میں غرق ہیں۔ واقعاً آج

---

[1]......(بالِ جبرئیلؑ، صفحہ ۳۶)

پاکستان کو علامہ اقبالؒ کی ضرورت ہے۔اس زمانے کے ہندوستان سے آج کا پاکستان اقبالؒ کا کہیں زیادہ محتاج تر ہے۔آج پاکستان کو اقبالؒ کے افکار ونظریات کی ضرورت ہے۔اقبالؒ کی روح کتنی تڑپتی ہوگی کہ جس نے دم بدم ہمیں آزاد کرانے اور خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے اپنی عمر کا لمحہ لمحہ قربان کیا۔ہم علامہ اقبالؒ کو فقط ایک شاعر سمجھتے ہیں جبکہ دنیا نے کہا کہ یہ بیداری کا پیغمبر ہے۔یہاں صرف اقبالؒ کو تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کی حد تک یاد رکھا گیا۔علامہ اقبالؒ کی سب سے بڑی نہضت اور تحریک یہ تھی کہ مسلمان بیدار و ہوشیار ہو جائیں اور ان کے اندر شعور آجائے کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔اقبالؒ کی تمثیلات بہت حسین ہیں۔ان کی تمثیلات میں سے ایک یہ ہے کہ اقبال نے جوانوں کا نام ''گل لالہ'' رکھا،اسی طرح اقبالؒ کا انسانِ کامل یعنی ''شاہین''۔آج استعماری منحوس پنجوں کے نیچے وہی گل لالۂ اقبالؒ تہس نہس ہیں اور شاہینِ اقبالؒ مغربی تہذیب کے پنجرے میں بند ہیں۔شاید ایک مولے سے بھی زیادہ کمزور تر ہیں۔یہ واقعیت ہے کہ سکیولرازم جیسے نظریات کی صورت میں اسلام کے خلاف بہت خطرناک محاذ جاری ہے۔ہمیں اس کے مقابل بیداری کی ضرورت ہے۔بقول اقبالؒ:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں......[1]

ہم طوفانوں سے ڈرتے ہیں لیکن اقبالؒ نے کہا: تم کسی طوفان میں جا پڑو تا کہ جاگ پڑو، ہوشیار و بیدار ہو جاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اور دنیا تمہارے بارے میں کیا سوچ رہی ہے؟ مزید فرماتے ہیں:

ترا بحر پرسکوں ہے، یہ سکوں ہے یا فسوں ہے؟
نہ نہنگ ہے، نہ طوفاں، نہ خرابیٔ کنارہ!......[2]

---

[1]......(ضربِ کلیم،صفحہ ۹۵)　　[2]......(ضربِ کلیم،صفحہ ۴۹)

فهرستین

- فهرست آیات
- فهرست روایات
- فهرست اشعار
- فهرست منابع و مآخذ

فہرستِ آیات

	آیت	صفحہ

سورۂ توبہ

سورۂ ہود

سورۂ فرقان

سورۂ نمل

سورۂ عنکبوت

سورۂ روم

فہرستِ روایات

صفحہ

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت امام علی علیہ السلام

حضرت امام حسین علیہ السلام

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

فہرستِ اشعار

صفحہ

(فارسی اشعار)

علامہ اقبالؒ:

مولانا روم:

صفحہ

نظامی گنجوی:

حافظ شیرازی:

(اردواشعار)

مرزا غالب:

علامہ اقبالؒ:

صفحہ

دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامان سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بناسکتی ہے میری ایک ہو
کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
دست فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے!...... 29

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی...... 93

فہرستِ منابع و مآخذ

● القرآن الکریم

● نہج البلاغہ

▼ ا

◄ ارمغانِ حجاز- علامہ اقبالؒ

◄ اسرارنماز- مرحوم ملامحسن فیض کاشانیؒ

◄ الجہادالاکبر- امام خمینیؒ

◄ الخصال- للشیخ الجلیل الاقدم الصدوق اَبی جعفرمحمد بن علی بن الحسین بن بابویہ القمیؒ، المتوفی: ۳۸۱ھ

◄ الکافی- الکلینیؒ

◄ المسجد فی فکرالامام الخمینیؒ

◄ الملہوف علی قتلی الطفوف- رضی الدین ابی القاسم علی بن موسیٰ بن جعفر بن طاووسؒ، المتوفی: ۶۶۴ھ

◄ الملہوف علی قتلی الطفوف- سید ابن طاؤوسؒ

▼ ب

◄ بالِ جبرئیل- علامہ اقبالؒ

◄ بانگ درا- علامہ اقبالؒ

◄ بحارالانوار- الشیخ علامہ محمد باقر المجلسیؒ

◀ بصائر الدرجات - ابو جعفر محمد بن الحسن بن فروخ "الصفارؒ" من اصحاب الامام الحسن العسکری علیہ السلام، المتوفی ۲۹۰ھ

▼ ت

◀ تاریخ النیاحۃ علی الامام الشہید الحسین بن علی علیہما السلام - السید صالح بن ابراہیم بن صالح الشہرستانیؒ

◀ تفسیر قمی - علی بن ابراہیم قمیؒ

◀ تفسیر المراغی - احمد مصطفیٰ المراغی

▼ ج

◀ جواہر الکلام - شیخ الفقہاء و امام المحققین الشیخ محمد حسن النجفیؒ

▼ د

◀ دیوان حافظ شیرازی، از روی نسخۂ تصحیح شدۂ علامہ محمد قزوینی

◀ دیوان غالب - مرزا غالب

◀ دیوانِ خمسہ - نظامی گنجوی

▼ ذ

◀ ذریعۃ النجاۃ - میرزا رفیع گرمرودیؒ

▼ ر

◄ روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی- شہاب الدین محمود بن عبداللہ الحسینی الآلوسی،
المتوفی: ۱۲۷۰ھ

▼ ش

◄ شرح نہج البلاغۃ - ابن ابی الحدید

▼ ص

◄ صحیفۂ نور - امام خمینیؒ

▼ ض

◄ ضربِ کلیم - علامہ اقبالؒ

▼ ع

◄ عوالی اللئالی - ابن ابی جمہور احسائی